

رسل کے مضامین

ترجمہ

تالیف و تعارف

قاضی جاوید

ڈاکٹر عصیم احمد



رسل کے مضا میں

تألیف و تعارف

ڈاکٹر نعیم احمد

ترجمہ

قاضی جاوید

مشعل

آر-بی 5، سینٹ فلور، عوامی کمپلکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600، پاکستان

ترتیب

3	ڈاکٹر نعیم احمد	تعارف
13		فرد آزاد کی عبادت
22		میرا عقیدہ
59		آزادی اور معاشرہ
72		خوش باش شخص
77		محبت اور زندگی
84		شادی
93		رومانتیک محبت
102		عورتوں کی آزادی

تعارف

برٹنیڈرسل کا شمار بیسویں صدی کے عظیم ترین مفکرین میں ہوتا ہے۔ وہ ۱۸۷۲ء میں برطانیہ کے ٹریلک ولز (Trelleek Wales) کے مقام پر پیدا ہوا۔ رسل کے دادا کا نام لارڈ جان رسل تھا جس نے ۱۸۳۲ء میں مشہور ”ریفارم بل“ پیش کیا تھا اور بعدازال ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں دوبارہ وزیر اعظم منتخب ہوا۔ مشہور فلسفی جان اسٹورٹ مل رسل کے والدین کا دوست تھا۔ رسل کی ڈہنی نشوونما میں مل کے انکار و نظریات اور اس کی غیر رسمی تعلیم و تربیت کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ رسل ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کے والدین انتقال کر گئے۔ رسل کے والد کی وصیت کی رو سے رسل اور اس کے بھائی کو ایک شخص کی تحویل میں دیا جانا تھا جس کے ان کے خاندان سے قریبی اور دوستانہ مراسم تھے لیکن بعدازال عدالت کی دخل اندازی سے اس وصیت پر عمل درآمد روک دیا گیا اور دونوں بھائیوں کو ان کے حقیقی دادا اور دادی کی تحویل میں دے دیا گیا۔ دو سال بعد رسل کا دادا بھی چل بسا۔ رسل کی دادی نے ہی رسل کی پروش اور تربیت میں موثر کردار ادا کیا۔ رسل نے دادی کا ذکر اپنی سوانح عمری میں نہایت محبت اور عقیدت سے کیا ہے۔ رسل کو ابتدائی تعلیم کے لیے مدرسہ نہیں بھیجا گیا بلکہ اس مقصد کے لیے شروع میں سوکش اور جرمن گورنیس رکھی گئی تھیں اور بعدازال ایک انگریز یونیورسٹی کا بندوبست کیا گیا تھا۔ رسل اپنی سوانح عمری میں دادی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

”میں بچپن میں ہی ان سے (دادی سے) بہت مانوس ہو گیا تھا۔ ان ہی کی شخصیت میرے لیے سب کچھ تھی۔ وہ بہت پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ جب دیکھو کتاب لئے بیٹھی ہیں، وہ سیاست اور مذہب سے بھی لگاؤ رکھتی تھیں۔ ہم لوگوں پر سوائے اخلاقی پابندیوں کے اور کوئی پابندی انہوں نے عائد نہ کی تھی..... چودہ برس کی عمر میں آکر میں دادی جان کے رویہ کا تجزیہ کر سکا، تب مجھے ان کی اخلاقی پاکیزگی بہت یاد آئی۔ بچوں کو جس

احساس تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مجھے ان سے ملا..... جیسے جیسے میں بڑا ہوا مجھے احساس ہوتا گیا کہ میری زندگی کو بنانے سنوارنے میں ان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بے خونی، عوامی رمحانات اور روایت سے قدرے بغاوت کا جذبہ مجھے انہی سے ورش میں ملا۔“

۱۸۹۰ء میں رسول کی بہر ج یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ یہاں اس نے ۱۸۹۰ء سے

۱۸۹۳ء تک ریاضی اور فلسفہ کی تعلیم ”ٹرینیٹی کالج“ میں حاصل کی۔ ۱۸۹۰ء سے ۱۹۰۱ء تک وہ ٹرینیٹی کالج کا فیلور ہا اور پھر اسی کالج میں درس و تدریس کے فرائض انعام دیتا رہا۔ ۱۹۱۳ء میں رسول کو ٹرینیٹی کالج سے اس کی آزاد روی کی بنا پر نکال دیا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں اسے ملازمت پر بحال کر دیا گیا لیکن رسول نے دوبارہ ملازمت کرنے سے انکار کر دیا۔

۱۹۱۳ء اور جنگ عظیم اول کے آغاز کے مابین کا دور وہ دور ہے جس میں ہمیں

رسول فکر و تحقیق کی انہائی بلندیاں چھوتا نظر آتی ہے۔

۱۹۱۲ء سے لے کر بیسوی صدی کے تیسے عشرے کے اوائل تک رسول نے

کوئی تعلیمی منصب حاصل نہیں کیا اور روزی کمانے کے لیے اس نے پہلے لیکھروں اور تصنیف و تالیف پر احصار کیا۔ اس ضمن میں ”تاریخ فلسفہ مغرب“ سے اسے خاصی معقول آمدی ہوئی۔ ول ڈیورنٹ کہتا ہے کہ برٹنیڈ رسول اصل میں دو تھے۔ ایک وہ جو جنگ عظیم اول کے آغاز تک زندہ رہا اور جنگ کے شروع ہوتے ہی مر گیا۔ دوسرا وہ جس نے جنگ کے بعد نیا جنم لیا۔ پہلا رسول منطقی ولسانی تجزیہ کا ماہر اور ریاضیاتی تجزیہات کا عاشق تھا لیکن جنگ کے شعلوں نے اس رسول کو جلا کر بھسپ کر دیا اور اس کی خاکستر سے نیا جنم لینے والا رسول ایک گہری سماجی بصیرت کا حامل اور انسان دوست نظر کا حامی تھا۔ اس کا دل دھکی انسانیت کے آلام و مصائب پر کڑھتا تھا چنانچہ اسے سماجی نا انصافیوں، حقوق انسانی کی پامالی اور جہالت کے خلاف پر کڑھتا تھا چنانچہ اس رسول نے سماجی نا انصافیوں، حقوق انسانی کی پامالی اور جہالت کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔ اس نے شروع میں ہی Principia Mathematica جیسی بلند پایہ کتاب شائع کر کے علمی علقوں میں احترام و عزت کا مقام پیدا کر لیا تھا۔ یہ کتاب ۱۹۱۰ء، ۱۹۱۳ء کے زمانے میں چھپی تھی۔ اس کے بعد اس نے تقریباً میں کے قریب فلسفیانہ کتابیں تحریر کیں۔ رسول کو ہم ریاضیاتی منطق کا امام کہہ سکتے ہیں۔ اس نئی پر بعد ازاں جتنی بھی ترقی ہوئی وہ رسول کی ذہنی کا وشوں ہی کا رہیں منت ہے۔ یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہو گا کہ رسول اور وائس نے ریاضی اور منطق کے

ملاپ سے جو زبان تخلیق کی اس سے جدید کمپیوٹر کا امکان پیدا ہوا۔ پہلی جنگلی عظیم نے رسول کی توجہ جن مسائل کی طرف مبذول کرائی، وہ مجرد علمی نوعیت کے نہیں بلکہ خالص انسانی اور سماجی نوعیت کے ہیں۔ وہ آزاد روسی، سماجی آزادی، آزاد تجارت، عام اور مفت تعلیم کا زبردست علمبردار تھا۔ انسان دوستی کے جذبات کے تحت ہی اس نے یہودیوں کی حمایت کی۔ متعصب انگریزوں میں اس کے خلاف سخت نفرت پیدا ہو گئی اور اس کی پاداش میں اسے قید و بند کی صورتیں بھی سہنا پڑیں۔

رسل نے ریاضیات، منطق، فلسفہ، مذہب اور تصوف کی حقیقت، علمیات اور متنوع سماجی اور تعلیمی مسائل پر متعدد کتب اور مضمایں تحریر کیے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے ہلکے ہلکے مضمایں اور افسانے بھی پر قلم کئے ہیں۔ جو امر رسول کی عالمگیر شہرت اور عوامی مقبولیت کا باعث بنا ہے وہ اس کا عظیم مظہر اور ریاضی دان ہونا نہیں بلکہ پُر عزم انسان دوست اور عالمی امن کا سرگرم داعی ہونا ہے۔ برٹیزیڈ رسن نے فروری ۱۹۷۰ء میں وفات پائی۔

اوپر یہ کہا جا چکا ہے کہ ابتدا میں رسول کی ساری دلچسپیاں ریاضی اور منطق تک محدود تھیں۔ میوسیں صدی کی دوسری دہائی میں ایگلو امریکن دنیا کے اندر منطقی اثباتیت کی تحریک کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ وکیلستان کے افکار کے زیر اثر وجود پذیر ہونے والی اس تحریک کا بنیادی مقصد مابعد الطبیعتی خرافات سے فلسفہ کی تطہیر اور اثباتی سائنسوں کے لئے مستحکم اساس کی تلاش تھا۔ منطقی اثباتی یہ کہتے تھے کہ تمام جملوں کو تین زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

الف: تجربی یا واقعی جملے۔

ب: تکراری جملے۔

ج: مابعد الطبیعتی جملے۔

تجربی یا واقعی جملے ان کے نزدیک اس لئے بامعنی ہیں کہ تجربہ سے ان کی تصدیق یا تکنیک ممکن ہے۔ تکراری جملے (Tautalogies) ریاضیات اور منطق کے قضاۓ ہیں اور اپنے اندر مساوات کا رشتہ لئے ہوتے ہیں، اس لئے انہیں بھی بامعنی کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً $2+2=4$ مساوات کے دائیں طرف جو بات کہی گئی ہے وہی مساوات کے دائیں طرف بھی ہے۔ اس لحاظ سے یہ جملہ اگرچہ کوئی نئی اطلاع فراہم نہیں کرتا، تاہم

بامعنی کہائے گا۔ جملوں کی تیسری قسم مابعد الطبیعتی جملے ہیں جو نہ تجربی جملے ہیں اور نہ ہی تکراری۔ اس لئے انہیں بامعنی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ معنویت صرف تجربی اور تکراری جملوں تک محدود ہے۔ اسی طرح صرف سائنس کے جملے اور ریاضی و منطق کے جملوں کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ وہ بامعنی یا ”وقوفی“ کہلا سکیں۔ تصوف، مذہب اور مابعد الطبیعتی کے جملے اس بنا پر بے معنی ہو کر رہ جائیں گے کہ ان کی نہ تو تصدیق یا تکذیب ممکن ہے اور نہ ہی وہ اپنے اندر تکراری جملوں کی طرح مساوات کا رشتہ لیے ہوتے ہیں۔

رسل پر منطقی اثباتیت کے ان نظریات کا گہر اثر تھا چنانچہ اس ضمن میں اس نے نہ صرف زبان کے مختلف مدارج کا نظریہ پیش کیا بلکہ ایک ایسی اشاراتی یا علماتی (Symbolic) زبان کی ضرورت کو بھی محسوس کیا جو بہام، ذہنویت اور فکری الجھاؤ سے پاک ہو۔ رسن اسی زبان کو سائنسی تعلیم اور وحدت علوم کے لیے ضروری خیال کرتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ عام روزمرہ کی گفتگو میں استعمال ہونے والی زبان اعلیٰ سائنسی نظریات کے ابلاغ و اظہار کا ذریعہ نہیں بن سکتی چنانچہ اس نے جارج بوول اور وائٹ ہیڈ کے تعاون و اشتراک سے ”اشریفیل انسائیکلو پیڈیا آف یونیفارمیڈ سائنسز“، کی متعدد جلدیں چھاپیں۔ رسن کی اس کاوش کی اساس منطق اور ریاضی کا ملاب پ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ریاضیاتی منطق ہی ایسی بلند پایہ اشاراتی زبان کی تخلیق کر سکتی ہے جو ایک طرف مختلف سائنسز کو وحدت بخشد اور دوسری طرف خالص سائنسی اور تکنیکی نظریات کا بے عیب اور قابل اعتماد اظہار و ابلاغ کرے۔ اس ضمن میں رسن نے جو کتابیں لکھیں ان میں ”اصول ریاضی“، ”فلسفہ کا خاک“، ”ذہن کا تجزیہ“، ”مادے کا تجزیہ“ اور ”خارجی دنیا کے بارے میں ہمارا علم“، سرفہرست ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ سیاسی و سماجی مسائل سے دلچسپی رسن کو ورثے میں ملی تھی۔ اپنی فکری زندگی کے ابتدائی دور میں جب کہ رسن کی ذہنی و تخلیقی صلاحیتیں اپنے عروج پر تھیں وہ منطق و ریاضی کی تجربیدی گہرائیوں میں مستغرق رہا اور سیاسی اور سماجی مسائل سے اس کی دلچسپی دبی رہی۔ لیکن جب جنگ عظیم کے مہیب شعلے بلند ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اقوام عالم کو اپنی پیٹ میں لے لیا تو رسن کا حساس ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اسے منطق و ریاضی کی روکھی پھیکی تجربید سے نکل کر زندگی کے ٹھوس اور سنگلاخ حقائق کی طرف توجہ دینا چاہیے اور جگئی جنون و وحشت جس طرح انسانی خون

کو ارزان اور شرف انسان کو پامال کر رہے ہیں، اسے قلمی اور عملی جدوجہد سے روکنا چاہیے۔ رسول اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے:

”جنگ کے حالات نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا لیکن ان معاملات سے دستبردار ہونا میرے لیے مشکل تھا اور نہ مجھے اندازہ تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں متشکل مزاجی کا شکار تھا۔ عجب قسم کا چڑچڑا پن مزاج کا حصہ بن گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ احتجاج کرنا میرا فرض ہے۔ سچائی کا ولادت ہوتے ہوئے میں شریک جنگ اقوام سے ناراض رہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بہت سے افراد تہذیب و تمدن کے ہمنوا ہوتے ہوئے بھی انسان کو دور وحشت کی طرف واپس لے جانا چاہتے ہیں۔“

رسل کو جس بات کا بہت زیادہ دکھ تھا وہ یہ تھی کہ عوام کی اکثریت بھی جنگ کی حامی بن گئی تھی۔ جنگی جنون نے فوج و سیاسی طالع آزماؤں کو ہی نہیں بلکہ گلیوں محلوں میں عام لوگوں اور بہت سے دانش و روسوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا وہ لکھتا ہے:

”میں جنگ کی تباہ کاریوں کے بارے میں سوچتا رہتا تھا اور میرا ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ سب سے بڑا خطرہ جو ہر دم مجھے لاحق رہتا تھا یہ تھا کہ معموم افراد کے مصائب بڑھ جائیں گے۔ لیکن ہمارے ملک کی بچانوںے فیصلہ آبادی از حد خوش تھی۔ میں ان دونوں تخلیل نفسی کے بارے میں کچھ بھی معلومات نہیں رکھتا تھا مگر انسانیت کے جذبے سے سرشار رہ کر، طبع انسان کے ذہنی مسائل کے بارے میں غور و فکر میں مصروف رہتا۔ میرا خیال تھا کہ اولاد و الدین کو بہت عزیز ہوتی ہے مگر جنگ کے اثرات نے عام افراد کے ان جذبات کو ماند کر دیا۔ میرا گمان تھا کہ مال و دولت کی چاہت لوگوں کو بزدل بنادیتی ہے مگر جنگ نے لوگوں کو دھن دولت کی محبت سے بھی بے نیاز کر دیا تھا۔“

رسل آگے چل کر لکھتا ہے:

”میرا عقیدہ تھا کہ دانشور طبقہ حق و انصاف کا علمبردار ہوتا ہے مگر پتہ چلا کہ صرف دس فیصد لوگ حق گوئی اور حقیقت پسندی کے روادار تھے..... جنگ کی صورت میں بھی انسان کی فلاح و بہبود کے لیے نہیں لڑی جا رہی تھی، بلکہ سیاسی بالادستی منوانے کا ایک عجیب حرپ تھا۔ اسی سوچ نے مجھے سیاستدانوں سے تنفس کر دیا..... جیسے ہی جنگ شروع ہوئی مجھے محسوس ہوا کہ کوئی قدرتی آواز تھی جو میرے اندر نہیں روح پھونک رہی تھی۔ میں نے دل

میں میان لی تھی کہ مجھے ہر قیمت پر جنگ کی مخالفت کرنا ہو گی، چاہے میرے احتجاجی استند لال کو کتنا ہی مہل اور ناکارہ کیوں نہ تصور کیا جائے۔ جملہ جنگوں اقوام کے پروپیگنڈے نے مجھے مزید مضھل کر کے رکھ دیا اور جنگ نواز ممالک کی پالیسیاں مجھے بہت بے قرار کرتی تھیں۔ میں حق پرست اور حقیقت پسند شخص تھا۔ میں تہذیب و تمدن کا فریفہ تھا مگر اس زمانے کی جنگی پالیسیاں دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہم وحشت اور بربریت کے دور کی طرف مراجعت کر رہے ہیں۔“

رسل نے اخبارات اور رسائل میں جنگ کے خلاف بہت سخت مضمایں لکھے۔

اس کے علاوہ اس نے جبری ہمدرتی کے خلاف عملی طور پر بھی مہم چالائی کہ معصوم لوگوں کو جنگ کی بھی میں جھونکنا سماجی اور اخلاقی طور پر اپنہائی میعوب اور ناپسندیدہ ہے۔ چنانچہ اس جرم کی پاداش میں اسے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۸ء تک کا زمانہ قید و بند کی صعوبتیں سبب ہوئے گزارنا پڑا۔

جب رسل کو جیل لے جایا جا رہا تھا تو ایک دلچسپ واقع پیش آیا۔ جیل کے وارڈن نے رسل کے کوائف کا اندر اراج ایک رجسٹر میں کرتے ہوئے اس سے اس کے مذہب کے بارے میں پوچھا۔ رسل نے جواب دیا کہ میں ایک لا اوری (Agnostic) ہوں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ میں نہ تو یہ جانتا ہوں کہ خدا ہے اور نہ ہی یہ جانتا ہوں کہ وہ نہیں ہے۔ وارڈن نے اس لفظ کے سچے پوچھے اور رجسٹر میں اندر اراج کرتے ہوئے کہا ”دنیا میں بہت سے مذاہب ہیں..... اور شاید ہی بھی ایک مذہب ہے..... مگر میرا خیال ہے کہ ہر مذہب کے لوگ ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں۔“ رسل کو ستمبر ۱۹۱۸ء میں جیل سے رہائی نصیب ہوئی۔

جنگ کے خلاف رسل نے جو ہم چالائی اس سے اسے یہ تکلیف یہ سبق ملا کہ صرف حکومتی اور سیاسی راہنماء ہی جنگی جنون اور انقاومی جذبات کا شکار نہیں ہوتے بلکہ عوام الناس کی اکثریت بھی اس رو میں بہہ جاتی ہے اور جنگ و جدل اور قتل و غارت سے ایک قسم کا حظ اور مسرت حاصل کرتی ہے۔ اس سے رسل اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہماری تہذیب میں انسانوں کی اکثریت آج بھی اپنی فطرت کی گہرائیوں میں وحشت و بربریت، جوش انقاوم اور تجزیبی رویوں کو پہنچا رکھتی ہے چنانچہ بہتر دنیا کی تکمیل اور پائیدار امن کے قیام کے

لیے ضروری ہے کہ انسان کے نفسیاتی رویوں میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کی جائیں۔ رسول کے اندر ایسی بنیادی نفسیاتی تبدیلیوں کی خواہش اتنی شدید تھی کہ وہ فلسفہ اور ریاضی کی تجربیدی اور نصابی دنیا سے نکل کر سماجی اور سیاسی مسائل کی پرخار وادی میں اتر آیا۔

نظام بندی (System Building) فلسفی کی ایک نمایاں روایت رہی ہے۔

قدیم فلاسفہ افلاطون اور ارسطو ہوں یا جدید فلاسفہ دیکارت اور اسپوزا، انہوں نے بڑے بڑے نظام ہائے فکر پیش کیے۔ ایک فلسفیانہ نظام فکر کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں متعلقہ مفکر ایک بنیادی بصیرت یا اساسی اصول کا ادراک کرتا ہے اور اس کو حیات و کائنات کے تمام پہلوؤں پر پھیلا دیتا ہے۔ افلاطون کو دیکھیے، اُسے اعیان و امثال کی معروضیت کا وجود ان حاصل ہوا چنانچہ اس کی مابعد الطبیعت ہو یا علمیات، سیاست و اخلاق کے مسائل ہوں یا طبیعت و فلکیات کے قوانین، سب پر اسی وجود ان کا گھر انگ چڑھا ہوا نظر آئے گا۔ یہی حال ارسطو، دیکارت، اسپوزا، لائیز وغیرہ کا ہے۔ نظام بندی کی یہ روایت ہیگل کے فلسفہ پر آکر منفتح ہوتی ہے۔ ہیگل کے بعد کا دور عومی طور پر نظام بندی کا دور نہیں بلکہ فکری تحریکات کا دور ہے۔ جس میں ہمیں منطقی اثباتیت، وجودیت، جدیاتی مادیت وغیرہ کی فکری تحریکیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ایک فکری تحریک میں یہ نہیں ہوتا کہ کسی اساسی وجود ان سے حیات و کائنات کے بارے میں مختلف نظریات کو منطقی طور پر مستبط کیا جائے، اس کے برعکس کسی فکری تحریک کے ارکان چند بنیادی حقیقوں کو اصولی طور پر تسلیم کر کے اپنے اپنے انداز میں ان کی توضیع و تشریح کرتے ہیں۔

اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو رسول کو ہم نظام بند فلسفی نہیں کہہ سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کو اس کے نصابی فلسفے میں منطقی ربط و تسلسل ضرور نظر آئے گا۔ لیکن اس کے عمرانی اور سیاسی افکار پر اس کی مابعد الطبیعتی اور منطقی بصیرت کا اثر نظر نہیں آتا۔ اس لحاظ سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے تغییبی، سیاسی، اخلاقی اور سماجی نظریات اس کے نصابی فلسفے کی توسعی ہیں۔ وہ برٹینڈرسل جو جنگ کے شعلوں میں جل کر راکھ ہو گیا تھا، خشک، متشد و اور بے رحم منطقی اور ریاضی دان تھا جو صحت فکر اور لسانی تجویہ کی قربان گاہ پر کسی قسم کے جذبہ کو بھی ذبح کرنے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ لیکن پرانے رسول کی خاکستر سے نیا جنم لینے والا رسول رحم دل، جذبوں کی حدت سے پھل جانے والا، انسانیت کی تذلیل و تحریر پر

کڑھنے والا، انسانی حقوق کی پامالی پر آنسو بہانے والا، جہالت، وحشت اور بربریت کے خلاف سینے پر ہو جانے والا اور تمام بھی نوع انسان کے لیے ایک تابناک اور خوش آئند مستقبل کے خواب دیکھنے والا برٹرینڈ رسل ہے۔ یہ اپنے عمرانی، سیاسی اور تعلیمی افکار میں ایسا ہی رسول نظر آتا ہے۔ یہ رسول ہمیں ایک شاعر، ایک صوفی، ایک مصلح اور امن و آشتی کا ایک پیامبر محسوس ہوتا ہے۔ اپنی کتاب ”سامنی نقطہ نگاہ“ کے باب ”سامنس اور اقدار“ میں وہ رفطر از ہے:

”اگر امن اور سکون و اطمینان بہت بڑے مقاصد ہیں تو ہم خوشی اور سرست کو ہی مقصد حیات بنا سکتے ہیں۔ جو شخص طاقت کو برائے طاقت حاصل کرنے کا خواہاں ہوتا ہے، اس کی ہوں اقتدار بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور اسے کہیں بھی چین نصیب نہیں ہوتا۔ عاشق یا شاعر ایسے شخص سے کہیں زیادہ بہتر ہوتے ہیں کیونکہ ان کا مطلوب و مقصود ان کے لئے وجہ ترار ہوتا ہے اور اس کا خیال و تصور ہی ان کے لیے روحاںی ڈھنی سرست کا باعث ہوتا ہے۔ طاقت کا پچاری ہر دم نئی سے نئی ایجاد کی دریافت میں سرگردان رہتا ہے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ اپنے اندر ایک خلاف سامنے محسوس کرتا ہے کیونکہ اس کے دماغ پر صرف طاقت کا نشہ چھایا ہوتا ہے۔ لطیف جذبات اس کے لیے اجنبی ہوتے ہیں۔ عاشق کی تسلیکین (واضح رہے کہ میں عشق و محبت کو وسیع ترین مفہوم میں استعمال کر رہا ہوں) جابر و قاہر کی تسلیکین سے کہیں زیادہ دیقیع اور برتر ہے اور اسے بلند ترین مقاصد حیات میں شمار کرنا چاہیے۔ میں جب اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہوں گا تو مجھے یہی خیال تکلیف نہیں دے گا کہ میری میانع حیات ضائع ہو گئی ہے۔ مجھے احساس ہو گا کہ میں نے شام کے وقت افق کے کناروں کو گلنا رہوتے دیکھا ہے، صبح دم شنبم کو گلنوں اور پتوں پر جھملاتے دیکھا ہے اور کہر آسودنوں میں برف پوش وادیوں کا نظارہ کیا ہے۔ تب میرے لئے یہ احساس باعث تسلیکین ہو گا کہ میں نے خشک سالی کی ماری ہوئی زمین کو موسلا دھار بارش میں جل تھل ہوتے دیکھا ہے اور کورن وال (Cornwall) کے ساحلوں پر بحر اوقیانوس کی بھری ہوئی لہروں کو سر پتختے دیکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سامنس ان لوگوں کے لیے ایسی خوشیاں فراہم کر سکتی ہے جو بذات خود ایسے مناظر قدرت کو دیکھنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔ (۱) اگر ایسا ہو تو سامنس کا استعمال داشمندانہ ہو گا۔ لیکن جب سامنس زندگی کو اس کی بنیادی قدروں سے محروم کر دیتی ہے تو سامنس کا کردار قابل تعریف نہیں رہتا۔ اقدار

(Values) کا دائرہ عمل سائنس کے میدان سے باہر ہے۔ ہم سائنس کو صرف اس حد تک قدر کا حامل کہہ سکتے ہیں کہ اس کی حیثیت علمی ہے لیکن اگر اسے قوت و اقتدار کے وسیلہ کے طور پر دیکھا جائے تو یہ قدرے سے عاری ہے۔ سائنسی تکنیک کا صرف ایک وظیفہ ہونا چاہیے اور یہ ہے کہ انسانی زندگی کو بہتر بنایا جائے اور اگر یہ انسانی اقتدار ہی کو پامال کر ڈالے تو یہ قابل مدمت ہے۔“

اگرچہ رسول مختلف سماجی و اخلاقی مسائل کے حل کے لیے مختلف اور متنوع نقطے ہائے نظر اختیار کرتا ہے، تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ چند بنیادی اقدار ایسی ہیں جو اس کے ان تمام نظریات میں روایت دوں ہیں۔ یہ اقدار ہیں امن، حقیقی مسrt، احترام آدمیت، بندی نوی انسان کی فلاح اور سب سے بڑھ کر آزادی۔ آزادی رسول کے نظام اقدار میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ فکر و نظر کی آزادی، مذہبی آزادی، آزاد تعلیم اور جنسی آزادی کا نقیب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارے سماج کی تعمیر جرپر ہوئی ہے۔ جدید معاشرہ انسانی آزادی کو کچلنے کے درپے ہے، اسی لیے فکر و عمل اور افہار و ابلاغ پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ اس طرح جدید انسان نہ حصول مسrt کا آرزو مند ہو سکتا ہے اور نہ ہی، بہتر انسان بننے کی تحریک پاسکتا ہے۔ اس کی زندگی پر طرح طرح کے خطروں، اندیشوں اور مصلحتوں کے سامنے منڈلاتے رہتے ہیں۔ بہتر انسانی سماجی اس وقت تک تشكیل پذیر نہیں ہو سکتا جب تک انسان کو اس کے بنیادی اور پیدائشی حق آزادی سے بہرہ مند نہیں کیا جاتا۔

آزادی کی شدید خواہش کی وجہ سے ہی رسول نے کمیونزم کی مخالفت کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کمیونٹ معاشرے اور اشتراکی نظام تعلیم کے بعض پہلوؤں کی تعریف کرتا ہے، لیکن مجموعی طور پر وہ اشتراکیت کو انسان دشمن قرار دیتا ہے۔ وہ ایک ایسے معاشرے اور ایک ایسے نظام تعلیم کا خواب دیکھتا ہے جس میں انسان کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں آزادانہ طور پر ارتقاء پذیر ہو سکیں۔ وہ اس معاملے میں جان ڈیوی اور ولیم جیمز کا ہم منوار ہے۔

زیر نظر کتاب میں مختلف سماجی موضوعات پر رسول کے چند اہم مضامین کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مضامین میں فرد آزاد کی عبادت، کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بعض نقاد اس مضمون کو بیسویں صدی کی بائبل قرار دیتے ہیں۔ یورپ میں یہ مضمون متعدد

جرائد و رسائل میں شائع ہوا۔ خود رسائل نے بھی اسے ایک سے زیادہ مجموعہ ہائے مضامین میں شامل کیا ہے۔ یہ مضمون رسائل کے سماجی فلسفہ کا شخص ہے۔ علاوہ ازیں زیرنظر انتخاب میں آزادی نسوان، شادی، جنس اور مسرت جیسے اہم موضوعات کے مضامین بھی شامل ہیں۔

یہ اعزاز ادارہ ”مشعل پاکستان“ کو حاصل ہے کہ رسائل کے سماجی فلسفہ کے اہم ترین موضوعات پر اردو زبان میں پہلی مرتبہ یہ انتخاب آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ادارہ مشعل گزشتہ دس برس سے اس سعی و کاوش میں مشغول ہے کہ مختلف سائنسی، علمی اور ادبی کتب و رسائل کے اردو تراجم قارئین کو مہیا کرے۔ بنیادی طور پر مشعل ایک غیر کاروباری ادارہ ہے جس کے پیش نظر مالی منفعت نہیں۔ مشعل کے تحت چھپنے والی کتب کا انتخاب ان کے معیار اور ملک میں ان کی علمی ضرورت کے پیش نظر کیا جاتا ہے۔ قبل ازیں رسائل کی ایک اہم کتاب ”تعلیم اور سماجی نظام“ کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ بھی زیرنظر کتاب کی طرح جناب قاضی جاوید نے کیا ہے۔ قاضی صاحب کا نام محتاج تعارف نہیں۔ موصوف ایک کہنہ مشق مترجم اور بالغ نظر دانشور ہیں۔

زیرنظر کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں رسائل کے بکھرے ہوئے سماجی افکار ایک باقاعدہ فلسفہ کی وحدت اختیار کر گئے ہیں۔ اردو زبان میں تحقیق و تحقیق کرنے والے حضرات کے لیے یہ ایک بہت بڑی سہولت ہے۔ قاضی جاوید صاحب کا یہ رواں اور سلیمانی ترجمہ علمی سطح پر اردو زبان کی وسعت کا باعث ہو گا۔ مجھے امید ہے کہ محققین کے علاوہ سببیدہ ادب کے شاکرین بھی اس کے مطالعے سے لطف اندوز ہوں گے۔

ملک کے معروف صحافی اور ادیب جناب مسعود اشعر ادارہ مشعل میں ایڈیٹر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے جس لگن اور مختصر وقت میں اس کتاب کی طباعت و اشاعت کا اہتمام کیا ہے، اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(ڈاکٹر نعیم احمد)

جامعہ پنجاب نیو کمپس لاہور

فروری ۱۹۹۳ء ۲۵

فرِ آزاد کی عبادت

ڈاکٹر فاؤسٹ کو اس کی سٹڈی میں میفسٹو فیلیس نے آفرینش کا قصہ یوں سنایا تھا:
 ”فرشتوں کے طائفوں کی ابدی تعریفیں خدا کے بے زار کرنے لگی تھیں۔ کیا وہ
 اُن کی حمد و شنا کا مستحق نہ تھا؟ کیا اُس نے ان فرشتوں کو ابدی مسرتیں عطا نہ کی تھیں؟ اس
 کے بجائے کیا زیادہ خوش کن بات یہ نہ ہوگی کہ ایسی حمد و شنا حاصل کی جائے جس کا جواز نہیں
 اور ایسی مخلوق سے پرستش کروائی جائے جس کو وہ اذیتیں دے۔ یہ سوچ کرو وہ دل ہی دل
 میں مسکرا یا اور طے کیا کہ عظیم کھلیں ہبلا جانا چاہیے۔“

”ان گنت زمانوں تک تپتا ہوا سماہیہ فضاوں میں لڑکھتا رہا اور آخر کار صورت
 پذیر ہونے لگا۔ مرکزی تودے نے سیاروں کو جنم دیا اور سیارے مٹھنے ہوئے۔ کھولنے
 ہوئے سمندر اور جلتے ہوئے پہاڑ و جود میں آئے۔ سیاہ بادلوں سے تپتی ہوئی بارشوں کے
 طوفان ائمے، جنہوں نے ٹھوں ہوتی ہوئی بالائی سطحوں کو غرق کر دیا۔ پھر سمندر کی
 گہرائیوں میں زندگی کا پہلا جراثومہ نمودار ہوا اور زندگی تیزی سے حرکت کرنے لگی۔ عظیم
 الشان جنگل نمودار ہوئے، سمندری عفریت جنم لینے لگے۔ انسان نے جنم لیا۔ انسان
 سوچنے کی قوت، خیر و شر کا علم اور پرستش کی ظالمانہ پیاس کا حامل تھا اور انسان نے دیکھا
 کہ اس پاگل اور بے ہنگم دنیا میں ہر کوئی موت کے بے رحم ہاتھوں میں جانے سے پہلے ہر
 قیمت پر زندگی کے چند لمحوں کی چھینا چھپی میں مصروف ہے اور انسان نے کہا کہ ضرور اس
 کے پیچھے کوئی مقصد ہے۔ کاش ہم اسے جان سکیں اور یہ مقصد ضرور اچھا ہوگا۔ ضرور کوئی
 ہستی ہے جس کی ہم پوچھ کریں اور ہمارے سامنے کی دنیا میں ایسی کوئی ہستی نہیں۔ تب
 انسان اپنی جدوجہد سے ہٹ گیا۔ اُس نے سوچا کہ خدا کا منشا یہ ہو گا کہ انسانی کا دشون سے
 انتشار میں نظم پیدا کرے اور پھر جب اُس نے ان جبلتوں کی پیروی کی جو درندوں سے خدا

نے اُسے منتقل کی تھیں، تو انسان نے اُسے گناہ کا نام دیا۔ اور خدا سے معافی کا طلب گار ہوا، پھر اُسے شک تھا کہ کیا اُسے معاف بھی کیا جا سکتا ہے یہاں تک کہ اُس نے ایک خدائی منصوبہ گھڑلیا جس کے ذریعے خدا کے غضب کو ٹھنڈا کیا جا سکتا تھا اور یہ دیکھتے ہوئے کہ حال بد ہے، انسان نے اُسے اور بھی بدتر بنا لیا تاکہ مستقبل سنوارا جاسکے۔ پھر اُس نے اُس قوت کے لیے خدا کا شکر ادا کیا، جس کے ذریعے اُس نے ہمند مسروں کو بھی تیاگ دیا تھا۔ اس پر خدا مسکرا یا اور جب خدا نے دیکھا کہ انسان نفس کشی میں اور پرستش میں کامل ہو گیا ہے تو اُس نے ایک اور آفتاب آسمانوں سے بھیج دیا جو انسان کے سورج سے ٹکڑا ایسا اور سب کچھ پھر سے سجا ہیے میں ڈھل گیا۔

”ہاں وہ بڑا بڑا یہ دلچسپ کھیل تھا میں ناٹک دوبارہ رچاؤں گا۔“

سائنس اس کائنات کی جو تصویر پیش کرتی ہے وہ اس سے بھی زیادہ بے معنی اور بے مقصد ہے۔ خیر ہمارے آدروں کو اسی قسم کی دنیا میں جگہ بنائی ہے جو اپنے مقاصد کی کوئی پیش بینی نہیں رکھتی تھیں۔ انسان کی اصل، اُس کی نشوونما، اس کی امیدیں اور خوف، محبتیں اور عقیدے سب کے سب سالمات کے حادثاتی اجتماع کا حاصل ہیں اور یہ کہ کوئی آگ، کوئی کار نامہ، ٹکر کی کوئی شدت اور احساس کی گہرائی، انفرادی زندگی کو موت کے بعد برقرار نہیں رکھ سکتی۔ تمام زمانوں کی مختنتوں، وفاداریوں، تخلیقی وجدانوں اور انسانی ذہن کی کامرانیوں کا مقصد بس یہ ہے کہ وہ نظامِ سماں کی عظیم موت کے ساتھ ہی فنا ہو جائیں، انسانی حالات کا مندر کائناتی ملے میں ڈھیر ہو جائے۔۔۔ یہ سارے امور اگرچہ شک و اختلاف سے بالآخر نہیں، لیکن اتنے لیکنی ضرور ہیں کہ انہیں مسترد کر کے کوئی فلسفہ قائم نہیں رہ سکتا۔ ان سچائیوں کے حصار میں رہتے ہوئے یاں کی مضبوط اساس پر ہی روح کا مسکن تعمیر کیا جا سکتا ہے۔

اچھا تو پھر اتنی دشمن اور غیر انسانی دنیا میں انسان جیسی بے بُس مخلوق اپنی امیدوں اور تمناؤں کو کیونکر برقرار رکھ سکتی ہے؟ یہ عجیب بھید ہے کہ انہی لیکن قادر مطلق فطرت نے بالآخر ایک ایسی مخلوق کو جنم دیا ہے جو اُس کے اختیار سے ماوراء سہی لیکن صاحب بصیرت ہے، خیر و شر کا علم اور خود فطرت کے کاموں کا جائزہ لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ موت فطرت کی بالا دستی کی علامت ہے اس کے باوجود انسان اپنی مختصر زندگی میں

دیکھنے، بھالنے، تقييد کرنے، جاننے اور اپنے تخیل میں تخلیق کرنے کے لیے آزاد ہے۔ اس ساری کائنات میں صرف انسان کو ہی یہ آزادی میسر ہے اور یہ آزادی اُس کی خارجی زندگی کو کنٹرول کرنے والی تمام جاہر قوتوں پر اُس کی برتری کا سبب بن گئی ہے۔

ہماری طرح غیر متمدن انسان بھی فطرت کی قوتوں کے رو بروائپی بے بھی محسوس کرتا ہے لیکن اُسے اس وقت سے بڑھ کر اپنے اندر کوئی ایسی شے نہیں ملتی جس کا وہ احترام کر سکے۔ لہذا وہ اپنے دیوتاؤں کے حضور سجدے کرنے پر آمادہ رہتا ہے اور یہ بھی نہیں سوچتا کہ آیا یہ دیوتاؤں کی پرستش کے لائق ہیں یا نہیں۔ حاسد دیوتاؤں کو خوش کرنے کی امید میں انسان نے جو دکھ اور ذلتیں برداشت کی ہیں ان کی طویل تاریخ نہایت اذیب ناک اور دل سوز ہے۔ خوف و دشتن سے کامپتا ہوا پچاری سوچتا ہے کہ دیوتاؤں کے حضور زندگی کی متاع عزیز قربان کرنے کے بعد ان کی خون آشامی کی ہوں ٹھنڈی پڑ جائے گی۔ اور وہ مزید کی تمنا نہ کریں گے۔ اس قسم کے عقیدوں کو ہم ”ملوک“ کے مذہب کا عنوان دے سکتے ہیں، یہ عقیدے اصل میں ایسے غلاموں کی اطاعت سے عبارت ہیں جو اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی یہ خیال نہیں ابھرنے دیتے کہ ان کے آقابندگی کے قابل نہیں ہیں۔ آدرشوں کی آزادی کو چونکہ ابھی تسلیم نہیں کیا گیا، لہذا قوت کی پرستش آسانی سے ہو سکتی ہے۔ وہ لاکھ دکھ دے، لیکن اُس کا بے انتہا احترام کیا جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ جب اخلاقیات مضمبوط تر ہوتی ہے اور آ درشی دنیا کے تقاضے محسوس ہونے لگتے ہیں تو پرستش اگر ختم نہ بھی ہو، تب بھی اس کا رخ و حشیوں کے تخلیق کردہ دیوتاؤں سے ہٹ کر دوسرے خداوں کی طرف ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ آ درش کے تقاضے محسوس کرتے ہوئے بھی شعوری طور پر انہیں مسترد کرتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ نگی قوت ہی پوچھ کے لائق ہے۔ بگولوں میں سے خدا نے حضرت ایوب سے بات کی تھی تو اس میں یہی رو یہ کار فرماتا ہا۔ خدائی قوت اور علم کی نمائش تو ہوتی ہے لیکن خدائی اچھائی کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ ہمارے ان معاصرین کا رو یہ بھی یہی ہے جو اپنی اخلاقیات کی بنیاد بقاء کی جدوجہد پر رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کامیاب رہنے والے ہی بہترین ہیں۔ خیر دوسرے لوگ بھی ہیں جو اخلاقی حس پر گراں گزرنے والے اس نظریے کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی نہ کسی پوشیدہ انداز میں حقیقت کی دنیا آدرشوں کے جہاں سے حقیقی طور پر ہم

آہنگ ہے۔ اس طرز فکر کو عام طور پر مذہبی قرار دیا جاتا ہے۔ اس طریقے سے انسان خدا کو تخلیق کرتا ہے جو قادر مطلق بھی ہے اور سر اپانیکی بھی اور جو موجو دار آ درش کے مابین پر اسرار وحدت کا حامل ہے۔

بہر حال حقیقت کی دنیا تو اچھی نہیں ہے۔ اس میں غلامی کا ایسا پہلو شامل ہے جس سے ہمارے خیالات کو پاک ہونا چاہیے۔ جملہ اشیا میں سے انسان کی عظمت میں اضافہ اچھی بات ہے لیکن یہ اضافہ انسان کو غیر انسانی قوت کے جر سے مکنہ حد تک آزادی دے کر یہی کیا جا سکتا ہے۔ جب ہم جان لیتے ہیں کہ قوت بڑی حد تک بُری ہے اور یہ کہ خیر و شر کے علم کے ساتھ انسان ایک ایسی دنیا میں محض ذرے کی حیثیت رکھتا ہے جو دنیا خود اس قسم کے علم سے محروم ہے تو پھر ہم دوبارہ اس انتخاب سے دوچار ہوتے ہیں کہ آیا ہم قوت کی پوچا کریں یا نیکی کی؟ کیا اپنے معبدوں کو قائم رکھیں جو شر پر مائل ہے یا ہم اُسے اپنے ہی ضمیر کی تخلیق مان لیں؟

اس سوال کا جواب اہم ہے اور ہماری پوری اخلاقیات کو گھرے طور پر متاثر کرتا ہے۔ قوت کی پرستش، جس کا ہمیں کار لائل، نظریہ اور عسکریت پسندی کے نظریے نے عادی بنا رکھا ہے، اصل میں معاند ائمہ کائنات کے رو برو اپنے آ درشوں کو قائم رکھنے میں ناکامی سے جنم لیتی ہے، یہ بجائے خود بدی کی غلامانہ بندگی ہے۔ طاقت کے آگے یہ سر جھکانا ہے تو ہمیں اُن قوتوں کی طاقت کے آگے جھکنا چاہیے جو ان غلط حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہیں جو یہ بات قبول نہیں کرتیں کہ حقائق اکثر بُرے بھی ہوتے ہیں۔ ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہماری دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو بصورت دیگر اچھی ہو سکتی تھیں اور یہ کہ ہم جن آ درشوں کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں اور جن کو ہمیں عزیز رکھنا بھی چاہیے، اُن کی تیکمیل اس دنیا میں نہیں ہوا کرتی۔ اگرچہ ان میں سے کسی شے کو بھی اندھی بہری کائنات کی تائید حاصل نہیں۔ لیکن آئیے ہم سچائی، حسن اور کمال کے اُس آ درش کے لیے اپنا احترام برقرار رکھیں جس کو زندگی ہمیں حاصل کرنے نہیں دیتی۔ قوت اگر بدی ہے جیسا کہ وہ دکھائی دیتی ہے تو آئیے ہم اُسے دل سے مسٹر د کر دیں۔ اس میں انسان کی سچی آزادی ضمیر ہے یعنی صرف اُس کے آگے جھکنا جس کو نیکی کے ساتھ ہماری اپنی محبت نے تخلیق کیا ہوا اور صرف اُس جنت کا احترام کرنا جو ہمارے بہترین لمحوں کی بصیرت کو لگیجت

کرتی ہوا۔ عمل اور خواہش میں تو ہمیں خارجی وقوتوں کے جر کے آگے متواتر سر جھکانا چاہیے لیکن فکر اور تجھیقی انج میں ہم آزاد ہیں۔ اس معاملے میں ہم دوسرے انسانوں سے آزاد ہیں اور بے مایہ سیارے سے بھی جس پر ہمارے جسم بے بھی سے ریگ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ جب تک ہم زندہ ہیں، ہم موت کے بے رحم ہاتھوں سے بھی آزاد ہیں۔ تو آئیے ہم عقیدے کی اس قوت کو پہلے پلے باندھ لیں جو ہمیں خیر کے وژن میں متواتر زندہ رہنے کے قابل بناتی ہے اور آئیے اس وژن کے ساتھ ہم حقیقت کی دنیا میں قدم رکھیں۔

حقیقت اور آدروش میں عداوت جب پہلے پہل اجاگر ہوتی ہے تو آزادی کے اثبات کے لیے پُر جوش بغاوت اور دیپتاوں سے غضب ناک نفرت ناگزیر دکھائی دیتی ہے۔ پروپری ٹھیس جیسے استقلال کے ساتھ مخالفانہ کائنات کے آگے ڈٹ جانا، اس کے شرکو ہمیشہ پیش نظر رکھنا اور تمام مصائب کو برداشت کرنا اُن سب کا فرض معلوم ہوتا ہے جو ناگزیر کے آگے جھکنے سے انکار کرتے ہیں لیکن غیظ و غضب بھی اصل میں ایک غلامی ہے، کیونکہ وہ ہمارے خیالات کو اس بد دنیا سے منسلک رہنے پر مجبور کرتا ہے، خواہش کی جس شدت سے بغاوت جنم لیتی ہے، اُس میں خود اثباتی کا عنصر بھی شامل ہے جس پر غالب آنا داناوں کے لیے ضروری ہے۔ غیظ و غضب ہماری خواہشوں کی نہیں، بلکہ ہمارے خیالوں کی اطاعت ہے جب کہ وہ بے نیازانہ آزادی جس میں داناٹی مضر ہے، ہمارے خیالوں کے بجائے ہماری خواہشوں کی اطاعت میں پائی جاتی ہے۔

ہماری خواہشوں کی اطاعت سے قناعت و بے نیازی کو خوبی پیدا ہوتی ہے۔ جب کہ ہمارے خیالات کی آزادی سے فن اور فلسفے کی پوری دنیا ہی پیدا نہیں ہوتی بلکہ حسن کا وژن بھی جنم لیتا ہے جس کے حوالے سے ہم آخر کار نارضا مند دنیا کو بڑی حد تک قابو میں کر لیتے ہیں۔ لیکن حسن کی یہ بصیرت آزادانہ سوچ بچار اور خواہشوں کے بوجھ سے آزاد فکر کے ذریعے ہی ہاتھ آتی ہے گویا آزادی صرف ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو زندگی سے وقت کے تغیر و تبدل کی زد میں رہنے والی خجی نعمتوں کی امید نہیں رکھتے۔

ترک دنیا کی ضرورت بدی کے وجود کی شہادت ہے تا ہم عیسائیت نے اس کا درس دیتے ہوئے ایسی داناٹی کا شوت دیا ہے جو پروپری ٹھیس کے فلسفہ بغاوت سے بڑھ کر ہے۔ یہ بات مان لئی چاہیے کہ ہم جن اشیاء کی آرزو کرتے ہیں ان میں سے بعض اگرچہ

ناقابل حصول ثابت ہوتی ہیں لیکن وہ حقیقی معنوں میں اچھی ہیں۔ بعض اوقات ایسی اشیا بھی ہیں جن کی ہم آرزو کرتے ہیں لیکن وہ خالص آرٹش کا جزو نہیں ہیں۔ بسا اوقات یہ عقیدہ غلط ثابت ہوتا ہے کہ جس شے کو لازماً ترک کرنا چاہیے وہ بُری بھی ہوتی ہے۔ تاہم یہ عقیدہ اُس قدر غلط بھی نہیں جس قدر بے لگام جذبہ اُسے غلط قرار دیتا ہے۔

صبر و قناعت میں ایک اور اچھا عصر بھی ہے وہ یہ ہے کہ جب حقیقی اچھائیاں ناقابل حصول ہوں تو ان کی شدت سے آرزو نہ کرنی چاہیے۔ ہر شخص کو جلد یا بدیر عظیم ترک دنیا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نوجوانوں کے لیے کوئی شے بھی ناقابل حصول نہیں ہوتی۔ اگر جذبے کی تمام ترشدت کے ساتھ کسی اچھی شے کی آرزو کی جائے اور وہ پھر بھی ناقابل حصول رہے تو نوجوانوں کے نزدیک وہ پسندیدہ نہیں رہتی۔ اس کے باوجود موت، بیماری، افلاس یا فرض کے تقاضے سے ہم سب کو جان لینا چاہیے کہ یہ دنیا ہمارے لیے نہیں بنائی گئی تھی اور یہ کہ جن چیزوں کی ہم آرزو کرتے ہیں، وہ چاہے کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں، مقدار ہمیں اُن سے محروم رکھ سکتا ہے۔ لہذا یہ امر بھی حوصلہ و جرأت میں شامل ہے کہ جب بد قسمتی ہمیں گھیر لے تو اپنی امیدوں کی بناہی کاماتم کیے بغیر ہم اپنے خیالات کو بے سود پچھتاوں سے محفوظ رکھیں۔ قوت کی اس قدر اطاعت نہ صرف جائز ہے بلکہ دانائی کی راہ بھی ہے۔

خیر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ دانائی مُھنگی مجبول ترک دینا پرمنی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف ترک دنیا کے بل بوتے پر ہم اپنے آرٹشوں کی پوچھ کے لیے مندرجہ تغیرتیں کر سکتے۔ یہ مندرجہ تغیرتیں میں، موسیقی میں، عقل میں پُرسکون وادی میں اور گیتوں کی سنہری شام میں نمایاں ہوتا ہے جہاں دکھ درد کے سائے، تبدیلی کے خوف اور حقیقت کی دنیا کی ناکامیوں اور مایوسیوں سے دور حسن جلوہ نہما ہوتا ہے۔ ان چیزوں پر غور و فکر سے ہمارے دلوں میں جنت کا وٹن صورت پذیر ہوتا ہے یہ وٹن ہمیں گرد و پیش کی دنیا کا جائزہ لینے کا پیانہ مہیا کرتا ہے اور وہ تخلیقی تحریک بھی عطا کرتا ہے۔

ناحوال بغاوت کی تخلیقی کے بغیر جب ہم مقدر کے خارجی غلبے کے آگے سر تسلیم ہم کرنا سیکھ لیتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی جان لیتے ہیں کہ غیر انسانی دنیا ہماری پرستش کے قابل نہیں تو پھر آخراً غیر شعوری کائنات کی نئی تشكیل اور اُسے اپنے تخلیل کے مطابق ڈھانے کی

کوشش ممکن ہو جاتی ہے۔ یوں مٹی کے بوسیدہ بست کی گلہ ایک نیا سنبھری صنم لے لیتا ہے۔ دنیا کی ساری حقائقوں۔۔۔ درختوں، پہاڑیوں اور بادلوں کی مری صورتوں، انسان کی زندگی کے واقعات، یہاں تک کہ موت کی ہمہ گیری میں بھی تخلیقی آدراش پسندی کی بصیرت ایک ایسے حسن کا عکس دیکھ سکتی ہے جس کی صورت میں گرمی پہلے پہل اُس کے اپنے خیالات نے کی تھی۔ اس طریقے سے ذہن فطرت کی بے شور قوتوں پر اپنی لطیف برتری کا اثبات کرتا ہے۔ جس قدر رشانگیز مادے سے اُس کا واسطہ پڑتا ہے، اتنی ہی زیادہ کامیابی اُسے غیر رضامند چٹان کو اپنا پوشیدہ خزانہ ظاہر کرنے پر مجبور کرنے میں ہوتی ہے۔ یوں وہ مخالف قوتوں کو اپنے آگے بے بس کر کے فخر انگیز کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے۔

جملہ فون میں سے الیہ سب سے شاندار ہے کیونکہ وہ اپناروشن قلعہ دشمن کے دل میں تعمیر کرتا ہے۔ اُس کے ناقابل تغیر و ایج ٹاورز سے دشمن کے سارے کمپ، باروں خانے، لشکر اور قلعے عریاں ہو جاتے ہیں۔ اُس کی چار دیواری میں آزاد زندگی روائیں دواں رہتی ہے جب کہ موت، دکھ اور یاس کے لشکر اور مقدر کی اندھی بہری قوتیں نئے تماشوں سے اس سے باک شہر کے باسیوں کو محفوظ کرتی ہیں۔

ایک خوبی ایسی ہے جس کوڑی بیٹی کا حسن نمایاں نہیں کرتا اور جو ہمیشہ اور ہر جگہ کسی نہ کسی طور زندگی میں موجود رہتی ہے۔ موت کے منظر میں، ناقابل برداشت درد کو سہنے میں اور بیتے ہوئے ماضی کے پلٹ کرنا آنے میں ایک ایسا لقنس، ایک ایسا جلال، اتحاد و سعتوں اور گھرائیوں کا احساس اور وجود کا ختم نہ ہونے والا بھید ہے جس کے حوالہ سے دکھ اٹھانے والا دنیا کے ساتھ درد کے رشتے سے بندھا رہتا ہے۔ بصیرت کے ان لمحوں میں ہم روز مرہ زندگی کی عارضی خواہشوں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے تگ و دوسرے ماورا ہو جاتے ہیں۔ انسانی رفاقت کی ٹھیکانی روشی ہماری کشتمی کے گرد پھیل جاتی ہے اور ہم اُس سیاہ سمندر کی جھلک دیکھتے ہیں جس کی لڑکڑاتی لہروں پر ہم چند ساعتوں کے سافر ہیں۔ دشمن قوتوں میں گھری ہوئی انسانیت کی تہائی ہماری روح پر اچاگر ہوتی ہے اور ہم جان لیتے ہیں کہ ہماری امیدوں اور وسوسوں سے بے نیاز کائنات کے سارے بوجھ کو ہمیں تھا ہی اٹھانا ہے تاریک قوتوں کے خلاف جدوجہد میں کامیابی ہی عظیم لوگوں کی شاندار رفاقت حاصل کرنے کا وسیلہ ہے۔ خارجی دنیا کے ساتھ اس پر جلال مجادلہ سے

دانش اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور ان کے جنم سے ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ موت، تبدیلی، ماضی کی ناداپی اور کائنات کی اندھی و بے معنی عجلت کے روز بروزان ان کی بے بسی عظیم قتوں کے ہاتھوں میں ہم کلہ پتی دکھائی دیتے ہیں لیکن ان قتوں کو روح کے مندر میں لانا، ان کو محسوس کرنا اور جاننا ان پر قابو پانے کے مترادف ہے۔

ماضی کی ساحرانہ قوت کا بھید یہی ہے۔ اُس کی ساکن اور خاموش تصویروں کی دلکشی خدا کے آخری ایمام کی سحرانگیز پاکیزگی جیسی ہے۔ ماضی بدلتا ہے اور نہ ہی مقابلہ کرتا ہے۔ اُس کی لہریں زندگی کی ساری عارضی چیزوں کو بہا کر لے جاتی ہیں۔ ہاں، جو کچھ جیسیں اور ابدی ہیں، وہ سیاہ رات میں چکنے والے ستاروں کی مانند باقی رہ جاتا ہے۔ جوروج رُس کے حسن کے قابل نہیں، وہ اُس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ البتہ جوروج مقدر کو زیر کر لیتی ہے، ابس کے لیے یہ نہ ہب کی کلید ہے۔

باہر سے نگاہ ڈالیے تو فطرت کی قتوں کے مقابلے میں انسان کی زندگی حقیر ہے۔ انسان وقت، مقدار اور موت کی پوچا کرنے پر مجبور ہے کہ وہ اُس کی اپنی قتوں سے بڑھ کر ہیں۔ بات یہ بھی ہے کہ اُس کی تمام تر خواہشوں، آرزوؤں اور امنگوں کو فطرت کی یہ قوتیں ہڑپ کر جاتی ہیں۔ ان قتوں کی عظمت بجا سہی، لیکن ان کے بارے میں سوچنا، ان کی بے جذبہ شان و شوکت کو محسوس کرنا اصل میں اُن سے عظیم تر ہے۔ ایسے ہی خیالات ہیں آزاد انسان بناتے ہیں تب ہم مشرقی طرز کی غلامی کے ساتھ فطرت کی ان قتوں کے حضور سجدہ رینہیں ہوتے بلکہ انہیں اپنی ذات میں جذب کر لیتے ہیں، انہیں اپنا جزو بنایتے ہیں۔ ذاتی مسروں کے لیے جدوجہد ترک کرنا، عارضی خواہشوں کے جال سے نکلنا اور ابدی چیزوں کی آرزو میں جانا ہی اصل میں نجات ہے اور یہی فرد آزاد کی عبادت ہے۔ یہ آزادی مقدر کے گیان وھیان سے حاصل ہوتی ہے کہ خود مقدر بھی اس ذہن کے تسلط میں آ جاتا ہے جو وقت کی کندن بنانے والی آگ کے لیے پاک کرنے کو کچھ نہیں چھوڑتا۔

ہم جنسوں کے ساتھ مشترک مقدر کے مضبوط ترین رشتے میں بندھا ہوا فرد آزاد محسوس کرتا ہے کہ اُسے روزمرہ زندگی کے ہر قدم پر محبت کی روشنی بکھیرنے والی بصیرت مل گئی ہے۔ انسان کی زندگی اندھیری رات میں ایک طویل سفر ہے جس میں غیر مریٰ دشمن

اُسے گھیرے رکھتے ہیں اور دکھ در داؤس کی راہ روکتے ہیں، اندھیرے کا یہ سفر ایک ایسی منزل کی طرف ہے جہاں تک پہنچنے کی امید صرف چند لوگ ہی کر سکتے ہیں اور جہاں کوئی بھی زیادہ عرصے تک رک نہیں سکتا۔ ساتھ ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے ہمارے ساتھی نظروں سے او جھل ہو جاتے ہیں۔ موت کے بے رحم ہاتھ انہیں نادیدہ دنیاوں میں پھینک دیتے ہیں وہ وقت بہت مختصر ہوتا ہے جب ہم ان کی مدد کر سکتے ہیں اور جس میں ان کی خوشیوں اور دکھوں کا فیصلہ ہوتا ہے۔ تو آئیے ہم ان کی راہ روشن کریں، ہمدردی کے مرہم سے ان کی محرومیوں کو کم کریں، انہیں سد بہار محبت کی مسرت عطا کریں، گرے ہوئے حوصلوں کو سہارا دیں اور پاس کے لمحوں میں یقین مہیا کریں۔

دوسروں کی خوبیوں اور خامیوں سے بے نیاز ہو کر ہمیں ان کی ضرورتوں، محرومیوں اور دکھوں پر توجہ دینی چاہیے، ہمیں بھولنا نہ چاہے کہ ہماری طرح وہ بھی سب زندگی کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ ہم سب ایک ہی الیہ کے کردار ہیں۔ اس لیے جب ان کا وقت ختم ہوا اور جب ماضی کی ابديت ان کی اچھائیوں اور برايئوں کو تغیر و تبدلیل سے ماورا کر دے تو ہم یہ محسوس کریں کہ جہاں کہیں انہوں نے دکھ اٹھایا، جہاں کہیں وہ ناکام ہوئے تو ہمارے لئے کوئی ضرورت اس کا سبب نہ تھی بلکہ جب بھی کبھی ان کے دلوں میں خدا کی شعلہ لپکا تو اس وقت ہم عملاً ان کا حوصلہ بڑھانے پر آمادہ تھے۔

انسان کی زندگی مختصر ہے اور لاچار بھی۔ ساری انسانی نسل بے رحم اور سیاہ مقدار کی ٹھوکر میں ہے۔ خیر و شر سے بے نیاز، تباہی و بربادی سے بے فکر قادر مطلق مادہ اپنی سفاک حرکت جاری رکھتے ہوئے ہے۔ آج ہم اپنے محبوب سے محروم ہوتے ہیں تو کل خود ہمیں اٹھاہ اندھیرے میں گم ہو جانا ہے۔ ایسے میں باوقار خیالات ہی ہمارے مختصر وقت کو عظمتوں سے ہم کنار کرتے ہیں۔

میر اعییدہ

انسان فطرت کا جزو ہے، اُس کا حریف نہیں۔ اُس کے خیالات اور جسمانی حرکات انہی قوانین کی پابند ہیں جو ستاروں اور ایٹمین پر حکمران ہیں۔ انسان کی نسبت سے طبی دنیا بڑی ہے بلکہ یوں کہیے کہ اُس سے بھی زیادہ وسیع و عریض ہے جتنی کہ دانتے کے زمانے میں سمجھی جاتی تھی۔ تاہم یہ دنیا اتنی بڑی نہیں جتنی کہ وہ سو ڈیہ سو سال پہلے معلوم ہوتی تھی۔ سائنس اُس کی حدود کو چھوٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ہماری کائنات مکان میں محدود دکی حامل ہے اور یہ کہ روشنی اُس کے گرد چند کروڑ برسوں میں سفر کر سکتی ہے۔ یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ ماڈہ الیکٹرونز اور پروٹونز سے تشکیل پاتا ہے جو جنم میں متناہی ہیں اور دنیا میں ان کی تعداد بھی لامحدود نہیں۔ پہلے یہ فرض کیا جاتا تھا کہ ان کے تغیر و تبدل میں تسلسل پایا جاتا ہے لیکن اب تسلسل میں یقین نہیں رکھا جاتا اور کہا یہ جاتا ہے کہ الیکٹرونز اور پروٹونز میں تبدلیاں جھکلوں کے ذریعے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ جھکلے ایک خاص حد تک کم از کم جھکلوں سے چھوٹے نہیں ہوتے۔ ان تبدلیوں کے قوانین کو چند بہت ہی عمومی اصولوں کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ کائناتی تاریخ کا کوئی مختصر حصہ علم میں آجائے تو یہ قوانین اُس کے ماضی اور مستقبل کا تعین کرتے ہیں۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ طبی سائنس ایک ایسے مرحلے کی طرف بڑھ رہی ہے جہاں وہ مکمل ہو جائے گی۔ گویا وہ غیر لچپ بھی ہو جائے گی۔ الیکٹرونز اور پروٹونز پر حکمرانی کرنے والے قوانین دستیاب ہوں تو باقی سارا کام جغرافیہ ہی رہ جائے گا، اس سے مراد مخصوص حقائق کا مجموع ہے جو کائناتی تاریخ کے حصے میں ان کی تقسیم کے بھیکھوتا ہے۔ کائناتی تاریخ کے تعین کے لیے درکار جغرافیائی حقائق کی تعداد غالباً محدود ہی ہے۔ نظری طور پر ان سب کو ایک خیم کتاب میں محفوظ کیا جا سکتا ہے جس کو حساب کتاب کرنے والی کسی مشین سے نسلک کر کے سرستہ ہاؤس میں رکھا جا سکتا ہے۔ جب مشین کا ہینڈل گھما یا

جائے گا تو وہ طالب علم کو ریکارڈ شدہ زمانوں کے علاوہ دیگر ادوار کے حقائق جانے میں مدد مہیا کر سکے گی۔ ظاہر ہے دریافت کاری کا ایسا عمل نہایت ہی پھنسھا ہو گا۔ یہ ایسے ہی ہے کہ ایک اونچے پہاڑ پر چڑھا جائے اور چوٹی پر جا کر معلوم ہو کہ وہاں بس ایک ریسٹورنٹ ہی ہے جس میں تجھر بیر کے سوا کچھ دستیاب نہیں اور یہ کہ ریسٹورنٹ کے گرد گھری دھند ہے لیکن اُس میں ایک وار لیس بھی نصب ہے۔

یہ ہے وہ بے لطف کائنات، انسان جس کا ایک حصہ ہے۔ دوسرے مادے کی طرح انسان کا جسم بھی الیکٹرونز اور پروٹونز سے بنتا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، انسانی جسم بھی انہی قوانین کا پابند ہے جو جیواناتی اور بنا تاتی دنیا کے علاوہ ساری کائنات پر جاوی ہیں۔ کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ فزیا لو جی کو بھی بھی فرکس میں تحلیل نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم اُس کے دلائل متنازع کن نہیں ہیں اور انہیں غلطی پر خیال کرنا داشت مندانہ ہی لگتا ہے۔ جس شے کو ہم اپنے خیالات کا عنوان دیتے ہیں اُس کا دار و مدار دماغ میں موجود پگڈنڈیوں کی تنظیم کاری پر اُسی طرح دکھائی دیتا ہے جس طرح عام سفر کا انحصار سڑکوں اور ریلوے لائنوں پر ہے۔ سوچنے کے عمل میں صرف ہونے والی توانائی کسی کیمیکل عمل سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آیوڈین کی کمی ہو تو چالاک ہوشیار شخص بھی احمد بن جاتا ہے۔ ذہنی مظاہر جسمانی ڈھانچے سے سنتھی دکھائی دیتے ہیں۔ اگر یہ باتیں درست ہیں تو پھر ہم یہ فرض نہیں کر سکتے کہ کوئی ایک الیکٹرون یا پروٹون ”غور و فکر“ کر سکتا ہے۔ یہ دیے ہی ہے جیسے ہم کسی ایک شخص سے تن تھا ف بال کا میچ کھینے کی توقع نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ہم یہ امید بھی نہیں کر سکتے کہ جسمانی موت کے بعد بھی کسی شخص کا غور و فکر کا عمل جاری رہتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ موت دماغ کی تنظیم کو ختم کر دیتی ہے اور دماغی پگڈنڈیوں کو بروئے کار لانے والی توانائی کو منتشر کر دیتی ہے۔

خدا اور ابدیت جو مذہب کے دو بنیادی عقیدے ہیں سائنس میں ان کے لیے کوئی تائید نہیں ملتی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مذہب کے لیے یہ دونوں عقیدے ناگزیر ہیں، کیونکہ بدھ مت میں یہ دونوں ہی نہیں ملتے۔ تاہم عیسائیت اور بعض دوسرے مذاہب میں ان دونوں عقیدوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ خیر سائنس ان کی تائید نہ کرے تو بھی لوگ ان پر ایمان رکھتے رہیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں عقیدے خوش گوار ہیں۔ تاہم جہاں

تک میرا تعلق ہے مجھے ان میں سے کسی کی بھی بنیاد دکھائی نہیں دیتی۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ خدا وجود نہیں رکھتا لیکن میں یہ بھی تو ثابت نہیں کر سکتا کہ شیطان کا وجود مخصوص فسانہ ہے۔ مسیحی خدا موجود ہو سکتا ہے تو اسی طرح اومپس کے دیوتا، قدیم مصر اور بائبل کے دیوتا بھی موجود ہو سکتے ہیں۔ تاہم ان سب کا وجود ایک دوسرے سے زیادہ یقینی نہیں ہے۔ وہ نہ صرف حقیقی بلکہ امکانی علم کی حدود سے بھی ماوراء ہیں لہذا ان میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی غور و فکر کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس مسئلے پر یہاں میں زیادہ تفصیل سے بات نہیں کروں گا۔ اپنی کتاب Philosophy of Leibniz کے پندرہویں باب میں اس مسئلے پر میں روشنی ڈال چکا ہوں۔

فرد کی بقا یا فرد کی ابديت کے مسئلے کی نوعیت کسی تدریج مختلف ہے۔ اس مسئلے پر دونوں طرف شہادت ممکن ہے، افراد روزمرہ کی دنیا کا حصہ ہیں، جس سے سائنس کا تعلق ہے۔ افراد کے وجود کا تعلیم کرنے والے حالات کو دریافت کیا جاسکتا ہے۔ پانی کا کوئی قطرہ لا فانی نہیں ہوتا۔ اس کو آکسیجن اور ہائیڈروجن میں تخلیل کیا جاسکتا ہے۔ اب اگر پانی کا قطرہ یہ دعویٰ کرنے لگے کہ اس میں ایک ایسی آبی صفت موجود ہے جو قطرے کے فنا ہونے کے بعد بھی موجود رہتی ہے، تو پھر ہم شے میں پڑ جائیں گے۔ اسی طرح ہم جانتے ہیں کہ انسانی دماغ فانی نہیں اور یہ کہ جب موت واقع ہوتی ہے تو کسی زندہ جسم کی متنفسن تو اتنا کی جامد ہو جاتی ہے لہذا وہ جسمانی عمل کے لیے دستیاب نہیں رہتی۔ تمام شہادتیں ظاہر کرتی ہیں کہ جس شے کو ہم اپنی ذہنی زندگی قرار دیتے ہیں، وہ دماغ کے ڈھانچے اور متنفسن جسمانی تو اتنا کی سے منسلک ہے۔ گویا یہ فرض کرنا بالکل معقول بات ہے کہ جسمانی زندگی کے خاتمے کے ساتھ ہی ذہنی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ استدلال حتمی کے بجائے امکانی نوعیت کا حامل ہے۔ تاہم یہ اس قدر مضبوط ضرور ہے جس قدر وہ دوسرے دلائل جن پر اکثر سائنسی نتائج کی بنیاد ہے۔

بہر طور اس نتیجے پر کسی حوالوں سے تقيید کی جاسکتی ہے۔ نفیا تی تحقیق دعویٰ کرتی ہے کہ اس کے پاس موت کے بعد بقا کی تحقیق سائنسی شہادت موجود ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اصولی طور پر اس کا طریقہ کار سائنسی طور پر درست ہے، اس قسم کی شہادت اتنی متنازع کن ہو سکتی ہے کہ کوئی سائنسی مزاج رکھنے والا شخص اسے مسترد ہی نہ کر سکے۔ تاہم اس

شہادت کے ٹھوس ہونے کا دار و مدار اس امر پر ہے کہ بقا کا متعلقہ مفروضہ کسی حد تک ٹھوس ہے۔ مظاہر کے ہر سیٹ کی توجیہہ مختلف طریقوں سے کی جاسکتی ہے اور ان میں سے ہمیں ایسے طریقے کو ترجیح دینی چاہیے جو مروجہ طور پر زیادہ قرین قیاس ہو۔ جو لوگ پہلے ہی یہ خیال کرتے ہوں کہ زندگی موت کے بعد بھی برقرار رہتی ہے وہ فوراً ہی اس نظریے کو نفسیاتی مظاہر کی بہترین توجیہہ کے طور پر قبول کر لیں گے لیکن جو لوگ بعض دوسری وجوہ سے اس نظریے کو ناکافی سمجھیں وہ دیگر توجیہات کی جتوڑ کریں گے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ بقا کے حق میں نفسیاتی تحقیق سے جو شہادت حاصل ہوئی ہے وہ اس کے بر عکس نقطہ نظر کی تائید میں حاصل شدہ فزیا لو جیکل شہادت کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔ تاہم میں یہ ماننے کو تیار ہوں کہ یہ شہادت کسی وقت بھی مضبوط ہو سکتی ہے، تب بقا پر یقین نہ رکھنا غیر سائنسی روایہ فرار پائے گا۔

بہر طور ہمیں یہ امر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جسمانی موت کے بعد بقا کا معاملہ ابدیت سے مختلف مسئلہ ہے۔ اس کا مطلب نفسیاتی موت میں محض تاخیر بھی ہو سکتا ہے۔ انسان جس شے کی خواہش کرتے ہیں وہ ابدیت ہے۔ ابدیت میں یقین رکھنے والے لوگ ان قریا لو جیکل دلائل پر انگلی اٹھائیں گے جس قسم کے دلائل میں پیش کرتا رہا ہوں۔ وہ یہ دعویٰ کریں گے کہ روح اور جسم دو بالکل مختلف چیزیں ہیں اور یہ کہ روح جسمانی اعضا کے ذریعے اپنے اظہارات سے بہت مختلف شے ہے۔ میرے نزدیک یہ دعویٰ ایک ماہ بعد الطبیعیاتی وہم ہے۔ ذہن اور مادہ دونوں تینی حقیقتیں نہیں بلکہ خاص مقاصد کے لئے استعمال کی جانے والی عمومی اصطلاحیں ہیں۔ روح کی طرح الکٹرودنزا اور پرولوںز منطقی افسانے ہیں۔ وہ مستقل ذات نہیں بلکہ دونوں درحقیقت ایک تاریخ، واقعات کا ایک سلسلہ ہیں۔ روح کے معاملے میں یہ امر نشوونما کے حقائق سے واضح ہے۔ اگر ہم جمل کے ٹھہرنا، ماں کے پیٹ میں بچے کے نشوونما پانے اور پھر شیر خوار کی کیفیت پر غور کریں تو سمجھدیگی کے ساتھ یہ یقین کرنا ممکن نہیں رہتا کہ روح کوئی ناقابل تقسیم اور مکمل شے ہے اور اس سارے عمل میں وہ ایک جیسی رہتی ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ وہ جسم کے ساتھ نشوونما پاتی ہے اور وہ ناقابل تقسیم نہیں ہے۔ اس کو ہم مادہ پرستی کا عنوان نہیں دے سکتے۔ یہ تو محض اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ قابل توجہ مسئلہ بنیادی جو ہر کا نہیں، بلکہ تنظیم کاری کا

معاملہ ہے۔

مابعدالطبيعتي مفکرین نے یہ ثابت کرنے کے لیے بے شمار دلائل دیئے ہیں کہ روح کو ابدی ہونا چاہیے۔ تاہم ان تمام دلائل کو رد کرنے کے لیے ایک سادہ سائنسیت کافی ہے۔ یہ سب صاحبان ایک جیسے انداز میں ثابت کرتے ہیں کہ روح پوری فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ چونکہ ہم موٹے ہونے کی اتنی خواہش نہیں کرتے جتنی طویل عمر کی تمنا کرتے ہیں، چنانچہ ان میں سے کسی بھی مابعدالطبيعتي مفکر نے اپنے استدلال کے اس اطلاق پر توجہ نہیں دی۔ یہ اس امر کی مثال ہے کہ کس طرح اچھے بھلے قابل افراد بھی خواہش کے حیرت انگیز اثر کے نتیجے میں ان مخالفوں کا شکار ہو جاتے ہیں جو دوسرے لوگوں کے لیے بالکل واضح ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہمیں موت کا ذرہ ہوتا تو پھر حیات جاوداں کا تصور ہی پیدا نہ ہوتا۔

انسانی زندگی کے بہت سے دوسرے مظاہر کی طرح مذہبی عقیدے کی بنیاد بھی خوف پر ہے۔ انفرادی یا اجتماعی طور پر انسانوں کا خوف ہماری سماجی زندگی کے بڑے حصے پر مسلط رہتا ہے۔ تاہم یہ فطرت کا خوف ہے جو مذہب کو جنم دیتا ہے۔ جیسا کہ ابھی ہم نے دیکھا، ذہن اور مادے کا تضاد کم و بیش وابہد ہے۔ تاہم ایک اور تضاد ہے جو زیادہ اہم ہے۔ اس تضاد میں ایک طرف ایسی اشیاء ہیں جو ہماری خواہش سے متاثر ہو سکتی ہیں اور دوسری طرف ایسی اشیاء ہیں جن کو خواہش کے ذریعے متاثر نہیں کیا جاسکتا۔ ان دونوں قسم کی اشیاء کے مابین فرق واضح ہے اور نہ ہی ناقابل تغیر۔ وجہ یہ ہے کہ سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ اشیاء انسان کے کنٹرول میں چلی آ رہی ہیں۔ پھر بھی بلاشبہ ایسی اشیا موجود ہیں جو انسانی خواہش سے بے نیاز ہی رہتی ہیں۔ ان میں ہماری دنیا کے وہ تمام بڑے حقائق شامل ہیں جن سے ماہرین فلکیات کو دلچسپی ہوا کرتی ہے۔ زمین کی سطح کے یا اس کے قریب کے حقائق ہی ایسے ہیں جن کو ہم کسی حد تک اپنی خواہش کے مطابق ڈھال سکتے ہیں۔ تاہم زمین کی سطح پر بھی ہماری قوتیں بہت محدود ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم موت سے نجات نہیں پاسکتے البتہ اسے تھوڑا بہت تال سکتے ہیں۔

مذہب اس تضاد پر قابو پانے کی ایک کوشش ہے۔ کائنات پر اگر خدا کی حکمرانی ہے اور ہم دعا کے ذریعے خدا سے کام لے سکتے ہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم خدا کی

قدت کاملہ میں کسی نہ کسی حد تک شریک ہو جاتے ہیں۔ پرانے زمانے میں دعاوں کے اثر سے مجرم سے رونما ہوا کرتے تھے۔ کیتھولک چرچ میں وہ اب بھی رونما ہوتے ہیں۔ البتہ پروٹستان فرقہ والے اس وقت سے محروم ہو گئے ہیں۔ خیر مجرموں کے بغیر بھی کام چلایا جا سکتا ہے، کیونکہ خدا کا فرمان یہ ہے کہ قوانین فطرت امکانی حد تک بہترین نتائج پیدا کریں گے۔ اس طرح خدا پر ایمان اب بھی فطرت کی دنیا کو انسانی اوصاف دینے اور انسانوں کو یہ احساس عطا کرنے کا کام دیتا ہے کہ طبعی قوانین اصل میں اُن کے دوست ہیں۔ بالکل اس طریقے سے ابدی زندگی کا عقیدہ موت کی دہشت کو ختم کر دیتا ہے۔ جن لوگوں کا عقیدہ یہ ہو کہ موت کے بعد وہ ابدی نعمتوں سے نوازے جائیں گے اُن کے بارے میں ہم امید کر سکتے ہیں کہ انہیں موت کا ڈر نہ ہوگا۔ تاہم یہ طب کے پیشے سے تعلق رکھنے والوں کی خوش تشقی ہے کہ اس قسم کا پختہ ایمان چند ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ بہر حال یہ عقیدہ موت کے خوف کو ختم نہ کرے تو بھی اُسے کسی نہ کسی حد تک کم ضرور کر دیتا ہے۔

ندھب کا منبع چونکہ دہشت ہے، اس لیے وہ بعض قسم کے خوفوں کو سرفراز کرتا ہے۔ اور لوگوں کو انہیں شرمناک نہ سمجھنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس لحاظ سے ندھب نے نسل انسانی کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی تلقین کے برعکس اصل میں یہ ہر قسم کے خوف برے ہیں میں یقین رکھتا ہوں کہ مرنے کے بعد میرا جسم مگل سڑ جائے گا۔ میری انا فنا ہو جائے گی اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ میں جوان نہیں ہوں اور مجھے زندگی سے محبت ہے۔ لیکن مجھے فنا کے خیال پر خوف سے تھر تھر کاپنے سے نفرت ہے۔ فنا کی حقیقت کے باوجود سچی خوشی ہی رہتی ہے۔ خیال اور محبت کی قدر و قیمت محض اس لیے ختم نہیں ہو جاتی کہ وہ ابدی نہیں ہیں۔ بہت سے انسان خودداری سے پھانسی کے تختے کو چوم لیتے ہیں۔ اس خودداری کو ہمیں کائنات میں انسان کے مقام کے بارے میں سچائی سے سوچنے کا درس بھی دینا چاہیے۔ پرانے قصے کہانیوں نے ہمیں سکون مہیا کیا تھا، سائنس نے ان کو ختم کر کے ہمیں خوف زدہ کر دیا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ سائنس ہی ہمیں سچائی سے روشناس کر سکتی ہے۔ فطرت کا فلسفہ ایک ہے اور قدر کا فلسفہ دوسری ہے۔ ان دونوں کو گذرا کرنے سے صرف نقصان ہی پہنچ سکتا ہے۔ جس کو ہم خیر قرار دیتے ہیں یا جس کو ہم پسند

کرتے ہیں، وہ اشیا کی حقیقت کو نہیں بدل سکتی۔ فلسفہ فطرت کا تعلق اسی حقیقت سے ہے۔ بہر حال اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم محسن اس لیے بعض چیزوں کو اہم نہ سمجھیں کہ غیر انسانی دنیا ان کی قدر نہیں کرتی۔ نہ ہی ہمیں محسن اس لیے کسی شے کی تعریف کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے کہ وہ فطرت کا قانون ہے۔ بلاشبہ ہم فطرت کا حصہ ہیں جس نے ان قوانین کے مطابق ہماری امنگیں، امیدیں اور خوف پیدا کیے ہیں جن کو اب ماہرین نفیات دریافت کرنے لگے ہیں۔ ہم مفہوم میں فطرت کا حصہ ہیں کہ فلسفہ فطرت میں ہم فطرت کے تابع ہیں فطرتی قوانین کا شر ہیں اور بالآخر یہی قوانین ہمیں شکار کر لیتے ہیں۔

زمین کہکشاں کے معمولی سیاروں میں سے ایک ہے۔ اس لیے فطرت کے فلسفے کو ناروا طور پر زمین تک محدود نہ ہونا چاہیے اور نہ ہی اُسے زمین کو مرکزی حیثیت دینی چاہیے۔ فلسفہ فطرت کو اس طرح توڑنا مردڑنا ممکنہ خیز ہو گا کہ اُس سے ایسے نتائج حاصل کیے جاسکیں جو اس معمولی سے سیارے کے بے ما یا طفیلیوں کو خوش کر سکیں۔ اس معاملے میں فلسفے کی حیثیت سے حیات پسندی اور ارتقا پرستی کے نظریے تو ازان اور منطقی تعلق کے شعور سے بے خبری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے حقائق کو جو ذاتی طور پر ہمارے لیے دلچسپ ہیں، صرف اس کرہ ارض تک محدود نہیں کرتے بلکہ کائناتی اعتبار سے اہم بنا کر پیش کرتے ہیں۔ کائناتی فلسفوں کے طور پر امید پرستی اور یاں پرستی بھی اس احمقانہ انسان پرستی کو ظاہر کرتے ہیں۔ فلسفہ فطرت کے حوالے سے ہم اس عظیم کائنات کو جس قدر جانتے ہیں اُس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری خوشی یا غمی سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی وہ اچھی یا بُری ہے اس قسم کے تمام فلسفے خود کو اہم خیال کرنے کے رویے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر ہم فلکیات کا تھوڑا بہت علم حاصل کر لیں تو ان کے فریب میں نہ آئیں۔

خیر، فلسفہ قدر کا معاملہ اس کے بر عکس ہے۔ ہم جو کچھ اپنے تجھیل میں لانے کے اہل ہیں، فطرت اُس کا صرف ایک حصہ ہے ہم ہر قسم کی حقیقی یا تجھیل اتی شے کی قدر کا تین کر سکتے ہیں اور کوئی ایسا خارجی معیار موجود نہیں جو ہماری لگائی ہوئی قدر کو غلط ثابت کر سکے۔ قدر کے تعین کا مطلق اختیار خود ہمارے پاس ہے۔ اس معاملے میں گویا ہم فطرت سے عظیم تر ہیں۔ اقدار کی دنیا میں فطرت بذات خود غیر جانب دار ہے۔ وہ اچھی ہے نہ بُری، خیر ہے نہ شر۔ وہ ہماری تعریف کی مسخ ہے اور نہ ہی ملامت کی۔ یہ انسان

ہیں جو قدر تخلیق کرتے ہیں اور ہماری خواہشیں قدر عطا کرتی ہیں اس سلطنت میں ہم خود بادشاہ ہیں اور جب ہم فطرت کے آگے چکتے ہیں تو اپنی بادشاہت کی تو ہیں کرتے ہیں ہمیں خود اچھی زندگی کا تعین کرنا ہے نہ کہ فطرت کو یا غیر فطرت کی تجسیم خدا کو۔

اچھی زندگی

مختلف زمانوں میں اور مختلف لوگوں کے نزدیک ایک اچھی زندگی کے بہت سے مختلف تصورات رہے ہیں۔ کسی حد تک ان اختلافات پر گفتگو ہو سکتی تھی۔ یہ اُس وقت ممکن تھا جب لوگ ایک طے شدہ منزل تک رسائی کے ذرائع پر ایک دوسرے سے اختلافات رکھتے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قید خانہ جرم کو روکنے کا اچھا طریقہ ہے۔ دوسروں کے نزدیک اس سلسلے میں تعلیم بہتر کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس قسم کے فرق کو کافی حد تک شہادت دستیاب ہونے پر دور کیا جاسکتا ہے لیکن بعض اختلافات ایسے ہیں کہ ان کا فیصلہ اس انداز سے ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر ثالثائی ہر قسم کی جنگ کی مذمت کرتا تھا۔ لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جن کے نزدیک حق کے لیے جنگ و جدل میں زندگی بس کرنا بڑی نیکی کی بات ہے۔ ان میں اختلاف غالباً دیلے کا نہیں بلکہ مقصد کے بارے میں ہے۔ جنگجو کی تعریف کرنے والے عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ گناہ گاروں کو سزا دینا بذات خود اچھی بات ہے۔ ثالثائی کی رائے مختلف تھی۔ اس قسم کے امور میں کوئی استدلال ممکن نہیں۔ لہذا میں یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ اچھی زندگی کے بارے میں میرا تصور درست ہے۔ میں تو بس یہ کر سکتا ہوں کہ اپنے تصور کو بیان کر دوں اور امید رکھوں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اُس سے اتفاق کریں گے۔ خیر، میرا تصور یہ ہے کہ اچھی زندگی وہ ہے جو محبت سے فیضان اور عمل سے رہنمائی حاصل کرے۔

علم اور محبت دونوں بے انت ہیں۔ اُن کی کوئی حد نہیں۔ اس لیے کوئی زندگی کتنی ہی اچھی ہو جائے اُس میں بہتری کا امکان موجود رہتا ہے۔ نہ تو علم کے بغیر محبت اور نہ ہی محبت کے بغیر علم اچھی زندگی کا سبب بن سکتے ہیں۔ قرون وسطی میں جب کسی ملک میں کوئی مہلک و باپھیلتی تھی تو بزرگ لوگوں کو عبادت گاہوں میں جمع کر کے خدا سے نجات کی دعا کیں مانگنے کو کہتے تھے، نتیجہ الٹ نکلتا وبا میں رحم کے مثالاً ہی جو موں میں غیر معمولی

سرعت کے ساتھ پھیل جاتیں۔ یہ صورت حال علم کے بغیر محبت کی مثال ہے۔ دوسری طرف حال یہ جنگی محبت کے بغیر علم کا حاصل ہیں۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ وسیع پیانے پر اموات اور بتاہی و بر بادی کی صورت میں نکلتا ہے۔

محبت اور علم اگرچہ دونوں ضروری ہیں، لیکن ایک لحاظ سے محبت کو اولیت حاصل ہے، کیونکہ وہ ذہین لوگوں کو علم کی جگہ پر آمادہ کرتی ہے تاکہ وہ جان سکیں کہ اپنے محبوب لوگوں کی کس طرح مدد کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر لوگ ذہانت سے محروم ہوں تو وہ سنی سائی باتوں پر ایمان لا کر مطمئن ہو جاتے ہیں اس طرح وہ چاہت کے باوجود فائدے کے بجائے نقصان کا سبب بن سکتے ہیں۔ میرے نکتے کی بہترین مثال طب کے شعبے سے مل سکتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مریض کے لیے مغلص ترین دوست کے مقابلے میں ایک لائق معانج زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح کسی معاشرے کی صحت کے لیے جاہل نہ خلوص اور ہمدردی کے مقابلے میں طبی علم میں ترقی زیادہ مفید ہوتی ہے۔ صورت حال کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر سائنسی دریافتوں سے صرف امیروں کو فائدہ پہنچانا مقصود نہیں تو پھر انسان دوست کا عصرِ لازمی ہو جاتا ہے۔ محبت کا لفظ بہت سے احساسات پر حاوی ہے۔ میں نے اس لفظ کو جان بوجھ کر استعمال کیا ہے، کیونکہ میں ان تمام احساسات کو شامل کرنا چاہتا ہوں۔ جذبے کے طور پر محبت و قطبوں کے درمیان تحرک رہتی ہے۔ (یہاں میں وضاحت کردوں کہ میرے نزدیک محبت جذبے کا معاملہ ہی ہے۔ جس شے کو اصول کے طور پر محبت کہتے ہیں، وہ مجھے حقیقی نہیں لگتی) ایک طرف غور و فکر سے حاصل ہونے والی غالص مسرت ہے اور دوسری طرف غالص فیضِ رسانی ہے جہاں تک بے جاں چیزوں کا تعلق ہے، ان سے تعلق میں صرف مسرت ہی شامل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے ہم کسی منظر سے کسی لینڈسکیپ سے مقابلے میں بچوں میں مضبوط تر ہوتی ہے کیونکہ وہ عموماً اشیا کو افادی انداز سے دیکھتے ہیں۔ جب انسانوں پر صرف جمالیاتی نقطہ نظر سے نگاہ ڈالی جائے تو یہ ہمارے احساسات میں اہم کردار ادا کرتی ہے انسانوں میں سے بعض دلیریب ہوتے ہیں اور بعض کا معاملہ اس کے بر عکس ہوتا ہے۔

محبت کے دوسرے سرے پر سخاوت یا فیضِ رسانی ہے۔ کوڑھیوں کی مدد کرنے

کے لیے لوگ جانیں قربان کرتے رہے ہیں۔ اس معاملے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں میں محبت کا جو جذبہ موجود تھا اس میں جمالیاتی مسرت کا کوئی عصر شامل نہیں ہو سکتا۔ ماں باپ کی محبت میں بچے کی ظاہری شکل و صورت سے حاصل ہونے والی خوشی بھی شامل ہوتی ہے لیکن اگر یہ خوشی شامل نہ ہو تو بھی والدین کی محبت مضبوط ہی رہتی ہے، یہاں بچے سے ماں کی دلچسپی کو ہمدردی کا عنوان دینا عجیب سامسوس ہو گا کیونکہ ہم عام طور پر اس لفظ کو نسبتاً کمزور جذبے کے لیے استعمال کرنے کے عادی ہیں تاہم کسی دوسرے فرد کی فلاں و بھلانی کی خواہش کو بیان کرنے کے لیے کوئی اور لفظہ تلاش کرنا مشکل ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جہاں تک والدین کے احساس کا تعلق ہے یہ خواہش کسی حد تک شدید ہو سکتی ہے۔ دوسرے معاملات میں اس کی شدت کم ہوتی ہے۔ یہ تو یہ ہے کہ ہر قسم کا بے غرضانہ جذبہ والدین کی محبت کی ہی کوئی نہ کوئی صورت ہوتا ہے۔ ہم اس جذبے کو یہاں ہمدردی کا نام دے سکتے ہیں۔ تاہم میں اس بات کی وضاحت ضروری خیال کرتا ہوں کہ میں یہاں اصول کا نہیں بلکہ جذبے کا ذکر کر رہا ہوں۔ اس لفظ سے بسا اوقات برتری کا کوئی احساس بھی منسلک ہوتا ہے تاہم میں اسے شامل نہیں کر رہا ہوں۔

کامل ترین صورت میں محبت مسٹر اور خیر خواہی سے عبادت ہوتی ہے اور ان دونوں عناصر کو ایک دوسرے سے الگ کرنا محال ہوتا ہے۔ خوبصورت اور کامیاب بچے سے ماں باپ کو جو خوشی ہوتی ہے اس میں یہ دونوں عناصر شامل ہوتے ہیں، یہی معاملہ بھرپور جنسی محبت کا ہے۔ تاہم جنسی محبت میں ہمدردی کا پہلو صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ احساس ہو کہ دوسرا فراد پوری طرح آپ کے بس میں ہے بصورت دیگر رقابت کا احساس اسے تباہ کر دیتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ رقابت کی صورت میں غور و فکر کی مسٹر بڑھ جاتی ہے۔ خیر خواہی کے بغیر مسٹر ظالمانہ ہو سکتی ہے جب کہ مسٹر کے بغیر خیر خواہی آسانی سے سرد مہری اور احساس برتری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ محبوب بننے کا آرزومند فرد ایسی محبت کا معروف بننا چاہتا ہے جس میں یہ دونوں عناصر شامل ہوں۔ البتہ شیر خوارگی یا یہاں ری جیسی انتہائی صورتوں میں معاملہ مختلف ہو سکتا ہے۔ ان صورتوں میں ہمدردی سے زیادہ تحسین و ستائش کی آرزو کی جاتی ہے۔ حکمرانوں اور مشہور حسیناؤں کی ذہنی کیفیت ایسی ہی ہوتی ہے۔ ہم دوسرے لوگوں کیلئے نیک خواہشات کی اتنی ہی آرزو کرتے ہیں جتنی

کہ مشکل کے وقت ان کی مدد کی خواہش کرتے ہیں یا پھر ان سے جس قدر خطرہ لاحق ہوتا ہے، یہ کم از کم صورت حال کی حیاتیاتی منطق معلوم ہوتی ہے لیکن زندگی کے مطالعے میں یہ حرفاً آخر نہیں۔ ہم تہائی سے فرار یا جیسا کہ عام طور پر کہتے ہیں، ”سمجھے جانے“ کی خواہش کے تحت بھی چاہت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ ہم جس فرد کی چاہت چاہتے ہیں، اُس کے بارے میں یہ آرزو بھی کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف ہماری بھلائی کا طلب گار ہو بلکہ اُسے یہ بھی معلوم ہو کہ ہماری خوشی کا دار و مدار کس بات پر ہے۔ خیر اس کا تعلق اچھی زندگی کے دوسرے عصر یعنی علم سے ہے۔

کامل دنیا میں ہر حاس شخص تمام تر دوسرے حساس افراد کے لیے اُس کامل محبت کا مرکز ہوتا ہے جس میں خوشی، ہمدردی اور افہام و تفہیم آپس میں یوں ملے ہوتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنا محال ہوتا ہے۔ ہر طور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس حقیقی دنیا میں ہم لوگوں کے بارے میں اس قسم کے احساسات رکھنے کی کوشش کریں۔ بہت سے لوگ تو ایسے ہیں کہ ہم ان سے خوشی محسوس نہیں کر سکتے کیونکہ وہ کراہت انگیز ہوتے ہیں۔ اپنے آپ پر جر کر کے اگر ہم ان لوگوں میں حسن تلاش کرنا چاہیں تو اس سے خود ہمارے احساسات ہی کند ہونے لگیں گے۔ بھر بات انسانوں کی نہیں، یہاں تو پس، کھلی اور جو میں بھی ہیں۔ ان سے خوشی حاصل کرنے کے لیے ہمیں اپنادل پتھر کا بنانا ہو گا۔ یہ بجا ہے کہ بعض درویش اس قسم کی چیزوں کو خدا کے موتی فرار دیتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ اس قسم کی باتیں کہہ کر اپنی درویشی کار عرب جانا چاہتے ہیں۔

ہمدردی کو آسانی سے پھیلایا جا سکتا ہے، لیکن پھر بھی اُس کی حد ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی خاتون سے شادی کرنا چاہتا ہے، لیکن مخفی اس لیے پیچھے ہٹ جاتا ہے کہ کوئی اور شخص اُس خاتون سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے تو ہمیں اُس کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے، اصل میں یہ مقابلہ کا معاملہ ہے، رقیب کے بارے میں اُس کے احساسات ہمدرد نہ ہو ہی نہیں سکتے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس دنیا میں اچھی زندگی کے تمام تصورات میں ہمیں حیوانی حیاتیت اور حیوانی جلت کا عصر شامل رکھنا چاہیے۔ اس کے بغیر زندگی بے لطف اور بے کیف ہو جاتی ہے۔ تہذیب کو اُس کی جگہ دینے کی بجائے اُس پر تہذیب کا اضافہ کرنا چاہیے۔ کنارہ کشی کی زندگی بس کرنے والے ولی اور زندگی کو تیاگ

دینے والے درویش اس معاملے میں بھر پور انسان نہیں ہوا کرتے۔ معاشرے میں اگر اس قسم کے لوگوں کی ایک چھوٹی سی تعداد موجود ہو تو وہ معاشرے کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں لیکن اگر دنیا میں بس سادھا اور درویش ہی ہوں تو دنیا بوریت کے ہاتھوں بتاہ ہو جائے گی۔

یہ بحث بہترین محبت کے جزو کی حیثیت سے مسرت کی اہمیت بڑھادیتی ہے۔

اس حقیقی دنیا میں مسرت ناگزیر طور پر محدود ہے اور وہ تمام نسل انسانی کے بارے میں یکساں احساسات رکھنے میں مانع ہوتی ہے۔ مسرت اور ہمدردی میں جب کبھی تضادات پیدا ہوں تو ان میں سے کسی ایک کو مکمل طور پر دبانے کی مجازیت اُن میں مصالحت کے ذریعے ان تضادات کو دور کرنا چاہیے۔ جلت کی اپنی ایک اہمیت ہے اور اگر ہم اُسے ایک حد سے زیادہ دبائیں تو وہ پچیدہ طریقوں سے بدلاہ اُتار لیتی ہے۔ لہذا اچھی زندگی کی جتنوں میں انسانی امکان کی حدود کو پیش نظر رکھنا لازم ہے۔ خیر یہاں ہم پھر علم کی ضرورت کے مسئلہ پر واپس آگئے ہیں۔

جب میں اچھی زندگی کے ایک عضر کی حیثیت سے علم کا ذکر کرتا ہوں تو اس سے میری مراد اخلاقی علم نہیں ہوتا۔ بلکہ میرا اشارہ سائنسی علم اور مخصوص حقائق کے علم کی طرف ہوتا ہے۔ میرے نزدیک حقیقی معنوں میں اخلاقی علم جیسی کوئی شے وجود نہیں رکھتی۔ جب ہم کسی مقصد کو حاصل کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں تو علم اُس کے حصول کے ذرائع کو اجاگر کر سکتا ہے۔ سرسری طور پر اس علم کو ہم اخلاقی قرار دے سکتے ہیں۔ تا ہم میں نہیں سمجھتا کہ ہم کس طرز عمل کے امکانی تباہ کو نظر انداز کر کے یہ طے کر سکتے ہیں کہ کون سا طرز عمل درست ہے اور کون سا غلط۔ جب کسی مطلوبہ مقصد کا لعین ہو جاتا ہے تو پھر سائنس ہی دریافت کر سکتی ہے کہ اس کے حصول کے لیے کون سا طرز عمل اختیار کیا جائے۔ جملہ اخلاقی اصولوں کا جائزہ اس حوالے لینا چاہیے کہ آبادہ ہمارے مطلوبہ مقاصد کے حصول میں مدد دیتے ہیں جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہمیں اور کس شے کی خواہش کرنی چاہیے۔ ”تو اصل میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کس دوسرے فرد کے نزدیک ہمیں کیا خواہش کرنی چاہیے۔ عام طور پر اس کا مطلب یہ خواہش ہوتی ہیں جو بالاتر افراد جیسے والدین، استاد، پولیس میں اور نجج صاحبان ہم پر ٹھوٹنا چاہتے ہیں۔

جب آپ مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ ”تمہیں فلاں فلاں کام کرنا چاہیے۔ تو آپ کی

بات کی قوت محکمیری اس خواہش میں مضمرا ہوتی ہے کہ میں آپ کی پسندیدگی کا لحاظ کروں پھر یہ بھی کہ آپ کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے ساتھ جزا اوسرا بھی مسلک ہو سکتی ہے۔ چونکہ انسانی سرگرمیاں خواہش سے جنم لیتی ہیں، لہذا یہ امر واضح ہے کہ اخلاقی تصورات کی بس اتنی ہی اہمیت ہے جتنا کہ وہ ہماری خواہشوں کو ممتاز کرتے ہیں۔ وہ یہ کام منظوری کی خواہش اور نامنظوری کے خوف کے ذریعے سرانجام دیتے ہیں۔ منظوری کی خواہش اور نامنظوری کا خوف طاقتور سماجی قوتیں ہیں۔ لہذا اگر ہم کوئی سماجی مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں تو پھر فطری طور پر ان قوتوں کو اپنے حق میں استعمال کرنا ہوگا۔

نظری اخلاقیات کا غیر ضروری ہونا سادہ مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے۔ فرض کیجئے کہ کسی شخص کا بچہ بیمار ہے۔ محبت کی وجہ سے وہ بچے کی صحت چاہتا ہے اور سائنس اسے علاج کا طریقہ بتاتی ہے ان دونوں باتوں کے درمیان ایسی اخلاقیات کے لیے کوئی گنجائش نہیں جہاں یہ بتایا جاسکے کہ بچے کا علاج کروانا اچھی بات ہے، بچے کے بیمار ہونے کی صورت میں آپ کا عمل ایک مقصد (یعنی بچے کی صحت یا بی) سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اس مقصد کو حاصل کرنے کے ذرائع کے علم کا رفرما ہوتا ہے۔ یہی بات تمام اعمال کے بارے میں درست ہے چاہے وہ اچھے ہوں یا بُرے۔ مقاصد میں فرق ہوتا ہے اور یہ بھی ہے کہ بعض مقاصد کے حصول کے لیے درکار علم موجود ہوتا ہے اور بعض کے لیے نہیں۔ تا ہم ایسا کوئی قابل تصور طریقہ موجود نہیں جس کے ذریعے لوگوں کو وہ کام کرنے پر بجور کیا جائے جس کو کرنے کے وہ خواہش مند نہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ جزا اوسرا کے کسی نظام کے ذریعے لوگوں کی خواہشیں ہی بدلتی جائیں اور اس نئے نظام میں سماجی منظوری یا نامنظوری کی قوتی ختم کر دی جائیں۔ یوں قانون ساز معلمین اخلاق کی توجہ کے لیے سوال یہ سامنے آتا ہے کہ سزا و جزا کا نظام کس طرح یوں ترتیب دیا جائے کہ قانونی احتارثی کی خواہش کی زیادہ سے زیادہ تیکیل کروائی جاسکے۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ قانونی احتارثی کی خواہشیں بڑی ہیں تو اس سے میری مراد یہ ہو گی کہ اس کی خواہشیں معاشرے کے اس حصے کی خواہشوں سے متصادم نہیں جس سے میرا تعلق ہے۔ انسانی خواہشوں سے ماوراء کوئی اخلاقی معیار وجود نہیں رکھتا۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی خاص قسم کا علم نہیں بلکہ خواہش ہی اخلاقیات کو سائنس

سے میز کرتی ہے۔ اخلاقیات میں بھی ویسا ہی علم درکار ہوتا ہے جیسا کہ علوم کے دوسرے شعبوں میں۔ جو شے اس سے مخصوص ہے وہ یہ ہے کہ بعض مقاصد کی خواہش کی جاتی ہے اور یہ کہ راست عمل ان کے لیے سازگار ہوتا ہے۔ بلاشبہ راست عمل کو وسیع پیمانے پر قابل قبول بنانے کے لیے ضروری ہے کہ مقاصد ایسے ہوں جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے قابل قبول ہوں۔ راست عمل سے گزر کر اگر میں وہ عمل لوں جو میری آمدنی میں اضافے کا موجب ہو، تو پھر قارئین اس سے اتفاق نہ کریں گے۔ میرے استدلال کی قوت اس کے سائنسی حصے میں مضر ہے۔۔۔ یعنی اس ثبوت میں کہ کسی اور طرز عمل کے بجائے ایک خاص قسم کا طرز عمل ایک ایسے مقصد کے حصول کا وسیلہ ہے جس کی بڑے پیمانے پر آرزو کی جاتی ہے۔ تاہم میں اخلاقی استدلال اور اخلاقی تعلیم میں امتیاز کرتا ہوں۔ اخلاقی تعلیم کا تعلق بعض خواہشوں کو مضبوط کرنے اور بعض کو کمزور کرنے سے ہے۔ یہ اس سے بالکل مختلف عمل ہے۔ آگے چل کر ہم اس کو موضوع بحث بنایں گے۔

اس ساری بحث کے بعد ہم زیادہ صراحةً کے ساتھ اچھی زندگی کے مفہوم کی وضاحت کر سکتے ہیں۔ میں نے جب یہ کہا تھا کہ اچھی زندگی علم سے رہنمائی حاصل کرنے والی محبت پر مبنی ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ میں ممکنہ حد تک اس قسم کی زندگی بس کرنا چاہتا ہوں اور دوسروں کو بھی ایسی ہی زندگی گزارتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس بیان کا منطق مشتملہ یہ ہے کہ جس معاشرے میں لوگ اس قسم کی زندگی بس کر رہے ہوں تو اس میں ان معاشروں کے مقابلے میں لوگوں کی خواہشیں زیادہ پوری ہوں گی جن میں علم یا محبت کی کارفرمائی کم ہو البتہ میں یہ دعویٰ نہیں کروں گا کہ اس قسم کی زندگی پاک باز ہوتی ہے اور یہ کہ اس کے بر عکس زندگی گناہ آسودہ ہوا کرتی ہے، وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اس قسم کے تصورات کوئی سائنسی جواز نہیں رکھتے۔

اخلاقی اصول:

اخلاقی قواعد و ضوابط کی عملی ضرورت خواہشات کے تصادم سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ تصادم مختلف لوگوں میں پیدا ہو سکتا ہے اور ایک شخص میں مختلف اوقات پر بلکہ ایک ہی وقت پر پیدا ہو سکتا ہے مثلاً کوئی شخص شراب بھی پینا چاہتا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے صبح کو وہ کام

کے لیے چاق و چوبند بھی اُٹھے۔ اب اگر وہ ایسا طرز عمل اپناتا ہے جس سے اُس کی مجموعی خواہش کی بہت کم تسلیم ہوتی ہے تو ہم اُسے بد اخلاق خیال کریں گے۔ اس طرح ہم فضول خرچ اور غیر محتاط افراد کے پارے میں اچھی رائے نہیں رکھنی چاہے ان کے طرز عمل سے خود ان کے سوا کسی اور کو نقصان نہ پہنچتا ہو۔ میتھم کے نزدیک ہر قسم کے اخلاقی اصول و قواعد کو ”روشن خیال“، خود غرضی سے اخذ کیا جاسکتا ہے گویا اگر کوئی شخص ہمیشہ زیادہ سے زیادہ تسلیم حاصل کرنے کے حوالے سے عمل کرتا ہے تو آخر کار وہ راست عمل ہو گا۔ میں اس نقطہ نظر کو قبول نہیں کر سکتا۔ ایسے کسی آمر گزرے ہیں جو لوگوں کو زخم لگا کر خوشی حاصل کرتے تھے۔ میں ایسے لوگوں کو پسند نہیں کر سکتا جو دنائی سے کام لیتے ہوئے محض اس لیے اپنے ستم رسیدوں کی جان بخشن دیتے ہیں کہ اس طرح انہیں اذیت کا ایک اور دن مل جائے گا۔

بہر طور دنائی اچھی زندگی کا جزو ضرور ہے۔ یہاں تک کہ رابن سن کر وہ سوکو بھی کبھی کبھار محنت، ضبط نفس اور بصیرت سے کام لینا پڑتا تھا۔ (یہ وہ خوبیاں ہیں جن کو لازماً اخلاقی صفات سمجھنا چاہیے) کیونکہ دوسروں کو پہنچائے جانے والے نقصان کا ازالہ کیے بغیر یوں اُسے حاصل ہونے والی تسلیم بڑھ جاتی تھی۔ اس قسم کے اخلاقی قواعد ایسے چھوٹے بچوں کی تربیت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں جو مستقبل کے بارے میں سوچنے کا کوئی میلان نہیں رکھتے لیکن بعد کی زندگی میں بھی ان پر زیادہ عمل کیا جائے تو یہ دنیا دیکھتے ہی دیکھتے جنت میں تبدیل ہو جائے۔ وجہ یہ ہے کہ اس طرح جنگوں کو روکنا ممکن ہو جائے گا۔ یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ جنگ فہم دنائی کا نہیں بلکہ جذبے کا کام ہے۔ دنائی کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ تاہم وہ اخلاق کا سب سے دلچسپ جزو نہیں ہے۔ مزید برآں یہ ذہنی مسائل پیدا کرنے والا جزو بھی نہیں کیونکہ اس کی حدود غرضی تک محدود رہتی ہے۔

اخلاقی ضوابط کا جو حصہ دنائی کی حد سے باہر ہے، اُس کی حیثیت قانون یا کسی کلب کے ضابطوں جیسی ہے۔ کہنا چاہیے کہ یہ اخلاقی ضابطے خواہشوں کے باہمی تکرار اور کے امکان کے باوجود انسانوں کو معاشرے میں مل کر رہنے کے قابل بنانے کا طریقہ ہے معاشرے میں ایک طرف تو فوجداری قانون ہوتا ہے جو دوسرے لوگوں کی خواہشوں میں بعض مخصوص طریقوں سے مزاحم ہونے والے اعمال کو قابل سزا قرار دے کر محض خارجی قسم

کی ہم آہنگی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ سماجی ملامت کا طریقہ بھی ہے۔ معاشرہ اگر کسی شخص کو بُرا سمجھے تو یہ بھی ایک قسم کی سزا ہے۔ اس سے بچنے کی خاطر اکثر لوگ سماجی ضابطوں کی خلاف ورزی کو چھپائے رکھتے ہیں۔ تاہم ایک اور طریقہ بھی ہے جو زیادہ بنیادی قسم کا ہے اور کامیاب ہونے کی صورت میں وہ زیادہ اطمینان بخش بھی ہوتا ہے۔ یہ طریقہ ہے دوسرے لوگوں کے کردار اور خواہشوں کو اس طرح تبدیل کر دینے کا کہ ایک شخص کی کامیابی دوسرے شخص کی خواہشوں سے امکانی حد تک ہم آہنگ ہو جائے اور یوں اُن میں تصادم کے موقع کم سے کم ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ محبت نفرت سے بہتر ہے، کیونکہ وہ متعلقہ افراد کی خواہشوں میں تصادم کی بجائے ہم آہنگ پیدا کرتی ہے۔ دو محبت کرنے والے افراد اکٹھے کامیاب ہوتے ہیں یا ناکام ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب دو افراد ایک دوسرے سے نفرت کر رہے ہوں تو پھر ان میں سے ایک کی کامیابی دوسرے کی ناکامی بن جاتی ہے۔

اب اگر ہماری یہ بات درست ہے کہ اچھی زندگی محبت سے فیضان اور علم سے رہنمائی حاصل کرتی ہے تو پھر یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ کسی معاشرے کا ضابطہ اخلاق حقیقی اور خود کفیل نہیں ہوا کرتا۔ اس کا جائزہ اس حوالے سے لینا لازم ہے کہ آیا وہ ایسا ضابطہ ہے جس کو دانش مندی اور ہمدردی کی تائید حاصل ہو۔ اخلاقی ضابطہ ہمیشہ غلطیوں سے پاک نہیں ہوتے۔ چنانچہ ازتیک لوگ (AZTEC) انسانی گوشت کھانے کو ناگوار فرض سمجھ کر پورا کرتے تھے، کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ اگر وہ انسانی گوشت نہ کھائیں گے تو سورج کی روشنی مدد ہم ہو جائے گی۔ گویا اپنی سائنس میں وہ غلطی پر تھے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اگر انہیں قربانی کا بکرا بننے والوں سے کوئی محبت ہوتی تو انہیں اپنے علم کی اس غلطی کا احساس بھی ہو جاتا۔ بعض قبائل دس سے سترہ برس کی دو شیزراویں کو سورج سے چھپا کر رکھتے ہیں انہیں ڈر ہوتا ہے کہ سورج کی شعائیں ان دو شیزراویں کو حاملہ کر دیں گی۔ کیا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے اخلاقی ضابطوں میں اس قسم کی حماقتوں شامل نہیں؟ کیا واقعی ہم ان بالتوں سے منع کرتے ہیں جو حقیقتاً نقصان دہ ہیں یا کم از کم اتنی مکروہ ضرور ہیں کہ کوئی نفیس آدمی ان کی حمایت نہیں کر سکتا؟ میں تو ان سوالات کا پورے اعتماد کے ساتھ ”ہاں“ میں جواب نہیں دے سکتا۔

موجودہ اخلاق، افادیت پرستی اور توہم پرستی کا عجیب و غریب ملغوہ ہے تاہم اس میں توہم پرستی کا عنصر حاوی ہے۔ یہ امر بالکل فطری ہے کیونکہ اخلاقی اصولوں کا منع توہم پرستی ہی ہے۔ زمانہ قدیم میں سمجھا جاتا تھا کہ بعض افعال دیوتاؤں کو ناراض کرنے کا سبب بنتے ہیں لہذا قانون کے ذریعے ان کی ممانعت کی جاتی تھی کیونکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ دیوتا ناراض ہوئے تو وہ صرف گناہ گارا فراد کو ہی نہیں بلکہ پورے کے پورے گروہوں کو سزادیں گے۔ یوں گناہ کا یہ تصور پیدا ہوا کہ گناہ وہ کام ہے جو خدا کو پسند نہیں۔ اس امر کا کوئی سبب تلاش نہیں کیا جاسکتا کہ خدا کو بعض افعال کیوں پسند نہیں ہیں چونکہ مذہبی کتابوں میں بعض افعال کو گناہ قرار دیا گیا تھا لہذا انہیں ناپسندیدی قبول کر لیا گیا۔ کبھی بکھار خدائی احکام کی نرالی توجیہات کی جاتی رہی ہیں۔ مثلاً ایک خدائی حکم یہ ہے کہ ”سبت“ کے دن کوئی کام نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے عیسائیوں کا پروٹستنٹ فرقہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اتوار کے روز کھیل کو د سے اجتناب کرنا چاہیے۔ وہ زمانے کب کے گزر گئے ہیں لیکن حالت یہ ہے کہ آج کے اخلاقی ضابطوں سے بھی وہی پہر جلال اتحاری منسوب کی جاتی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ زندگی سے متعلق سامنی نقطہ نظر رکھنے والا کوئی شخص مذہبی کتب یا چرچ کی تعلیمات سے خوف زدہ نہیں ہوگا۔ اس کا طرز فکر یہ نہ ہو گا کہ فلاں فلاں کام گناہ میں داخل ہے اور استدلال کی ضرورت نہیں، وہ یہ دیکھنے کی کوشش کرے گا کہ آیا وہ کام واقعی نقصان دہ ہے یا یہ کہ اسے گناہ قرار دینے والا تصور خود ہی نقصان دہ ہے۔ وہ دیکھے گا کہ خاص طور پر جنس سے متعلق آج کے اخلاقی قواعد و ضوابط میں بھی توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کا بہت سا عصر شامل ہے۔ وہ یہ بھی دیکھے گا کہ کم از کم لوگوں کی طرح ہماری ضعیف الاعتقادی میں بھی غیر ضروری ظلم و ستم شامل ہے اور اگر لوگ اپنے ہمسایوں کے بارے میں محبت اور ہمدردی کے جذبات رکھنے لگیں تو یہ ظلم ختم ہو سکتا ہے۔ لیکن معاملہ یہ ہے کہ روایتی اخلاق کے حامی اکثر اوقات پھر دل لوگ ہوتے ہیں، ملاؤں کی جنگ جوئی اور سنگ دلی سے ہم اس حقیقت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ ان لوگوں کے نزدیک اخلاقی ضابطے اصل میں دوسروں کو رنج پہنچانے کا جائز وسیلہ ہیں۔ اس لیے وہ گناہ گاروں پر کسی لیت و لعل کے بغیر جھپٹ پڑتے ہیں۔

آئیے ہم مہد سے لحد تک ایک عام انسانی زندگی کا جائزہ لیں اور ان نکات کو

نوٹ کریں جہاں تو ہم پرست اخلاقی ضابطے غیر ضروری دکھ کا موجب بننے ہیں۔ اچھا تو آئیے میں زندگی کی ابتدائی ہی حمل سے بات شروع کروں۔ ایسے مرحلے پر تو ہم پرستی کا اثر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اب اگر بچے کے ماں باپ آپس میں شادی شدہ نہیں تو بچے کو شرمناک فرد یا لکنک سمجھا جاتا ہے۔ یہ بالکل غیر ضروری رد عمل ہے، کیونکہ بچے کا اس میں کوئی قصور نہیں کہ اُس کے ماں باپ آپس میں شادی شدہ ہیں یا نہیں۔ اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک کسی جنسی بیماری میں مبتلا ہو تو وہ عموماً بچے کو بھی وراثت میں ملتی ہے۔ مالی و رسائل کے مقابلے میں اگر والدین کے بچے پہلے ہی زیادہ ہوں تو پھر انہیں افلس، کم غذا سیت، بھوم اور غائب آپس میں مبادرت کا خدشہ بھی لاحق ہوگا۔ اس کے باوجود معلمین اخلاق اور مذہبی رہنماؤں کی بھاری اکثریت مانع حمل دواؤں کے ذریعے اس قسم کی بد بخشی کو روکنے کی مخالفت کرتی ہے۔ ان لوگوں کو خوش کرنے کی خاطر ان لاکھوں انسانوں کو دکھ جھیلنے پڑتے ہیں جن کی پیدائش کو آسانی سے روکا جاسکتا تھا۔ اس کی وجہ مخفی یہ ہے کہ معلمین اخلاق اور مذہبی رہنماؤں کے نزدیک جنسی مبادرت صرف بچے پیدا کرنے کی غرض سے ہوئی چاہیے، بصورت دیگروہ حرام کاری ہے۔ ازتیک قبیلے کے ستم کا شکار ہونے والے افراد اچانک ہلاک کیے جاتے تھے اور ان کو کھالیا جاتا تھا۔ ان نشانہ بننے والے افراد کے مقابلے میں اُس بچے کو کہیں زیادہ مصائب برداشت کرنے پڑتے ہیں جو غربت اور دکھ کے ماحول میں جنم لیتا ہے یا جو پیدائشی طور پر بھی کسی جنسی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہ وہ مصائب ہیں جن کے ذمے دار مذہب کے نام پر ملا، پادری اور سیاست دان بننے ہیں۔ اگر ان کے دل میں بچوں کے لیے ذرا سی محبت یا رحم کا کوئی جذبہ ہوتا تو وہ اُس اخلاقی ضابطے سے ہرگز چھٹے نہ رہتے جو اس شیطانی ظلم اور بربریت کا ذمہ دار ہے۔

پیدائش کے وقت اور زندگی کے ابتدائی مہینوں میں ایک عام بچہ ضعیف الاعتقادی سے زیادہ معاشر اسباب کے ہاتھوں تکلیف اٹھاتا ہے جب خوشحال گھرانوں کی عورتیں بچے جنتی ہیں تو انہیں بہترین ڈاکٹر، بہترین نرسیں، بہترین خوراک، بہترین آرام اور بہترین ورزش دستیاب ہوتی ہے۔ محنت کش اور غریب طبیعے کی عورتوں کو یہ آسانیش حاصل نہیں ہوتیں اور اس وجہ سے اکثر اوقات ان کے بچے مر جاتے ہیں، سرکاری حکام اور ادارے ماؤں کی دیکھ بھال پر شاز و نادر ہی توجہ دیتے ہیں۔ بچوں کی دیکھ بھال اور

انہیں مناسب خوراک مہیا کرنے کے بجائے یہ حکام صاف سترے اور پُرسکون علاقوں میں شاندار رہائشی علاقے بنانے پر زیادہ توجہ دیتے ہیں، انہیں جاننا چاہیے کہ اس قسم کا طرز عمل اختیار کر کے وہ بہت سے بچوں کو جرم اور افلاس کے ہاتھوں موت کے سپرد کرتے ہیں۔ اس کے باوجود حکمرانوں کو ملاؤں کی اکثریت کی تائید حاصل رہتی ہے۔ یہ لوگ ہیں جو سماجی ظلم اور بے انصافی کو تو ہم پرستی کا سہارا عطا کیے ہوئے ہیں۔

تعلیم کے تمام مراحل میں تو ہم پرستی کا اثر اکثر تباہ کن ٹابت ہوتا ہے۔ بچوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ جسے غور و فکر کی عادت ہوتی ہے۔ ہماری تعلیم کا ایک مقصد اس عادت کو ختم کرنا ہے پچھے جب ناگوار سوال کرتا ہے تو اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے یا پھر سزا دی جاتی ہے۔ اس طرح اسے زبان بند رکھنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ پچھے میں خاص قسم کے اعتقادات پیدا کرنے کی خاطر اجتماعی جذبے کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ سرمایہ دار، جنگ پرست اور ملا بچوں کی تعلیم میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان سب کی قوت کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ معاشرے میں تلقیدی سوچ محدود رہے اور جذبات پرستی کا رواج قائم رہے۔ انسانی فطرت کی مدد سے ایسی تعلیم عام آدمی کے ان میلانات کو بڑھانے اور ان میں شدت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

اساتذہ کے انتخاب پر اثر انداز ہو کر بھی تو ہم پرستی تعلیم کو نقصان پہنچانے کا سبب بنتی ہے۔ معاشی اسہاب کے حوالے سے اس بات پر اصرار کیا جاتا ہے کہ خاتون استاد کو شادی شدہ نہیں ہونا چاہیے اور اخلاقی اسہاب کے حوالے سے اسے شادی سے ماوراء جنسی تعلقات نہیں رکھنے چاہیں۔ اس کے باوجود جس کسی نے غیر صحیت مند نفیات کا مطالعہ کرنے کی تکلیف گوارا کی ہے اسے خوب معلوم ہے کہ زیادہ عرصے تک کنواری رہنا عام طور پر عورت کے لیے بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہ عورت کے لیے اس قدر نقصان دہ بات ہے کہ کسی صحیت مند معاشرے میں خاتون اساتذہ میں اس کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے گی۔ خاتون اساتذہ پر جو پابندیاں لگائی جاتی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حوصلہ مند اور ہم جو خواتین مدرسیں کے شعبے میں داخل ہونے سے انکار کرنے لگی ہیں۔ یہ سب کچھ تو ہم پرست رہبانیت کے نچے کچھ اثرات کا نتیجہ ہے۔

درمیانے اور بالائی طبقے کے مدرسون میں صورت حال اس سے بھی زیادہ

خراب ہے ان مرسوں میں عبادت گاہیں قائم ہیں اور اخلاقی امور کی دیکھ بھال مذہبی افراد کے پرداز ہے۔ اخلاق کے اساتذہ کی حیثیت سے یہ مذہبی افراد و طریقوں سے کم و بیش لازماً ناکام ہو جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایسے افعال کی مذمت کرتے ہیں جو حضور رسالہ نہیں ہیں اور دوسرا یہ کہ وہ ایسے افعال کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو بہت نقصان دہ ہوا کرتے ہیں۔ یہ سب مذہبی لوگ ان غیر شادی شدہ لوگوں کے درمیان جنسی تعلقات کو ناپسند کرتے ہیں جو ایک دوسرے کو پسند تو کرتے ہوں لیکن ابھی انہیں اس بات کا یقین نہ ہو کہ آیا وہ زندگی بھر کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ بھی ہے کہ اکثر مذہبی لوگ بر تھک نظریوں کی مذمت کرتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اس شوہر کو مُرا بھلانہیں کہتا جو زیادہ بچے سپیدا کر کے بیوی کی موت کا سبب بن جاتا ہے۔ میں ایک فیش اسیل مذہبی شخص کو جانتا ہوں جس کی بیوی نے نو برس میں نو بچے سپیدا کیے تھے۔ ڈاکٹروں نے اسے تنبیہ کی تھی کہ اگر اس نے ایک اور بچہ جانا تو مر جائے گی لیکن اگلے ہی برس وہ پھر حاملہ ہوتی اور مر گئی۔ مگر کسی نے اس کے شوہر کی مذمت نہ کی۔ گرچہ سے اس کو مسلسل آمدی ہوتی رہتی اور اس نے ایک اور بیاہ رچالیا۔ مذہبی لوگ جب تک ظلم کو نظر انداز کرتے رہیں گے اور معصوم مسروتوں کا گلا گھوٹنے پر تیار رہیں گے، تب تک نوجوانوں کے اخلاق کے محافظت کی حیثیت سے وہ صرف نقصان ہی پہنچا سکتے ہیں۔

تعلیم پر تو ہم پرستی کا ایک اور ناگوار اثر یہ ہے کہ کئی نسل کو جنسی حقائق کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ سن بلوغت سے پہلے بچوں کو اہم جسمانی حقائق کا درس سادگی سے اور فطری انداز میں دینا چاہیے۔ اس زمانے میں یہ حقائق جذبات نہیں بھر کاتے پھر بلوغت کے زمانے میں ایک حقیقت پسندانہ جنسی اخلاقیات کے عناء صرکا علم مہیا کرنا چاہیے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ تعلیم دی جانی چاہیے کہ باہمی رغبت کے بغیر جنسی مباشرت کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ بات مذہب کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ جب تک عورت اور مرد شادی شدہ نہ ہوں اور مرد ایک اور بچے کا خواہش مند نہ ہو، اسے مباشرت نہیں کرنی چاہیے۔ اگر بیوی کی رضا مندی شامل نہ ہو تو بھی چرچ مرد کو مباشرت کی اجازت دیتا ہے۔ تاہم میں یہ کہتا ہوں کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک دوسرے کی آزادی کا احترام کرنا سکنا چاہیے۔ انہیں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ کوئی شے بھی ایک انسان کو دوسرے

انسانوں پر حقوق عطا نہیں کرتی اور یہ کہ حسد اور ملکیت کی خواہش محبت کی قاتل ہے۔ انہیں یہ درس دینے کی ضرورت بھی ہے کہ کسی فرد کو دنیا میں لانا، اُس کی پیدائش کا سبب بننا ایک سنبھیڈہ معاملہ ہے۔ لہذا یہ کام اُسی وقت کرنا چاہیے جب بیدا ہونے والے بچے کی صحت، سازگار ما حل اور والدین کی محبت کے اچھے امکانات موجود ہوں۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو برتحک کنٹرول کے طریقوں کی تعلیم دینا بھی ضروری ہے تاکہ اس امر کو یقینی بنایا جاسکے کہ وہ بچے صرف اُس وقت پیدا کریں گے جب ان کی ضرورت ہوگی۔ علاوہ ازیں انہیں جنسی پیاری اور اس کے علاج کے طریقوں کا علم بھی میا کیا جانا چاہیے۔ ان خطوط پر جنسی تعلیم سے انسانی مسروتوں میں بے پناہ اضافہ ہو سکتا ہے۔

اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ بچوں کی پیدائش کا خیال یہ بغیر جنسی تعلقات محض نجی معاملہ ہے۔ ریاست یا ہمسایوں کا اُن سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے۔ جس کی بعض صورتیں جو بچے کی پیدائش کا سبب نہیں بنتیں، فوجداری قانون کے تحت آج کل قابل سزا ہیں لیکن یہ تو ہم پرستی ہی ہے، کیونکہ اس معااملے سے جنسی کھیل میں شریک فریقین کے سوا کوئی اور شخص متاثر نہیں ہوتا۔ بچوں کی موجودگی کی صورت میں طلاق کو بہت زیادہ دشوار بنا دینے سے لازمی طور پر بچوں کو فائدہ نہیں پہنچتا۔ مسلسل بلانوشی، جفا کاری، یا جنون وہ نمایا دیں ہیں جن کی بنا پر طلاق بچوں کے لیے اور یہوی یا شوہر کے لیے ضروری ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں طلاق کے سلسلے میں بدکاری کو جواہیت دی جاتی ہے وہ سراسر غیر معقول ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بدسلوکی کی بعض ورتوں کبھی بدکاری کے مقابلے میں ازدواجی مسروتوں کے لیے زیادہ نقصان دہ ہیں۔ اس سے نقصان دہ بات تو یہ ہے کہ مرد ہر سال ایک نئے بچے کے لیے اصرار کرے لیکن روایتی طور پر اس طرز عمل کو بُر انہیں سمجھا جاتا۔

اخلاقی اصول ایسے نہیں ہونے چاہئیں جو جبلی مسروت کو محال بنا دیں۔ جس معاشرے میں عورتوں اور مردوں کی تعداد میں بہت زیادہ فرق ہو وہاں یک زوجگی جبلی مسروتوں کے حصوں میں بہت بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ بلاشبہ ان حالات میں اخلاقی اصولوں کی خلاف ورزی ہوتی ہے لیکن اگر اصول ایسے ہوں کہ جن کی پابندی معاشرے کی مسروتوں کو بڑی حد تک کم کر کے ہی ممکن ہو اور جب ان اصولوں کی پابندی سے اُن کی

خلاف ورزی بہتر ہو جائے تو ان اصولوں کو بدلانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اصولوں کو نہ بدلا جائے تو عوامی مفاد کے خلاف کام نہ کرنے والے لوگوں کو ریا کاری سے کام لینا پڑتا ہے یا پھر رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چرچ اس ریا کاری کو مراہیں سمجھتا ہے لیکن دوسرے لوگ اب ریا کاری کو مراہیں سمجھنے لگے ہیں۔

قوم پرستی والی تو ہم پرستی مذہبی تو ہم پرستی سے بھی زیادہ نقصان دہ ہے۔ تاہم میں یہاں اس مسئلے پر مفصل بحث کرنے کے بجائے مخفی یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم جس محبت کو اچھی زندگی کا جزو خیال کرتے ہیں وہ صرف ہم وطنوں تک محدود نہیں رہتی۔ محبت کو اس حد میں مقيد کرنا روش خیال خود غرضی کے بھی خلاف ہے کیونکہ مدد و دفعہ قوم پرستی فاتح قوموں کے لیے بھی مفید ثابت نہیں ہوتی۔

مجرموں کے ساتھ ہم جس انداز میں پیش آتے ہیں اُس میں گناہ کے مذہبی اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ عقلی اخلاقیات اس نظریے کی تائید نہیں کر سکتی کہ مجرم گناہ گارا اور فاسق ہوتے ہیں اور سزا کے مستحق ہوتے ہیں۔ اس میں شہر نہیں کہ بعض لوگوں کے کرتوں ایسے ہوتے ہیں جن کو معاشرہ روکنا چاہتا ہے اور ممکنہ حد تک اُن کو روکنے کی کوشش کر کے معاشرہ اچھا قدم اٹھاتا ہے۔ قتل کی مثال لے لیجئے۔ ظاہر ہے اگر معاشرہ اپنے وجود کو قائم رکھنا چاہتا ہے اور ہم اُس کی مسروتوں اور فائدوں سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہیں تو پھر ہم لوگوں کو اس امر کی اجازت نہیں دے سکتے کہ جب اُن کا جی چاہے وہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگیں۔ تاہم اس مسئلے سے خالص سائنسی انداز میں مٹھا چاہیے۔ ہمیں مخفی یہ سوال اٹھانا چاہیے کہ قتل کو روکنے کا بہترین طریقہ کیا ہے؟ قتل کو روکنے کے مورثین طریقے دو ہوں تو ہمیں ان میں سے اُس طریقے کو ترجیح دینی چاہیے جس میں قاتل کو کم نقصان پہنچتا ہو۔ ڈاکٹر کے آپریشن سے پیدا ہونے درد کی طرح قاتل کو پہنچنے والا نقصان بھی افسوسناک ہوتا ہے۔ اچھا، قاتل کو تکلیف پہنچانا ضروری تو ہو سکتا ہے، لیکن اس میں خوشی کی بات کوئی نہیں ہے۔ جس انتقامی جذبے کو ہم ”اخلاقی برہمی“، کاعنوں دیتے ہیں، وہ ظلم کی ایک صورت ہے۔ انتقامی سزا کے تصور کے ذریعے ہم کبھی مجرم کی ایذ ارسائی کو جائز ثابت نہیں کر سکتے، تعلیم اور رحم دلی مل کر اگر انتقامی سزا جتنی موثر ہوں تو پھر ہمیں تعلیم اور رحم دلی کو ترجیح دینی چاہیے، اور اگر وہ زیادہ موثر دکھائی دیں تو انہیں ترجیح بھی زیادہ دینی

چاہیے۔

جرم کی روک تھام اور جرم کی سزا و مختلف مسائل ہیں۔ مجرم کو سزا جرام کی روک تھام کے لیے دی جاتی ہے۔ جیلوں کی صورت حال انسانی تقاضوں کے مطابق ہو جائے تو وہاں معاوضہ کے بغیر اچھی تعلیم ملنے لگے تو ہو سکتا ہے لوگ جیلوں میں داخل ہونے کے لیے جرام کا ارتکاب کرنے لگیں۔ لہذا جیلوں کے حالات کو آزادی کے مقابلے میں کم خوش گوارہونا چاہیے لیکن اس مسئلے کا حل یہ نہیں کہ ہم جیلوں کو ممکنہ حد تک عبرناک بنا دیں بلکہ بہترین حل یہ ہے کہ ہم آزادی کو زیادہ خوش گوارہ اور مسروت انگیز بنائیں۔ بہر حال میں یہاں تعریضی اصلاح کے موضوع پر بحث کا ارادہ نہیں رکھتا۔ میں بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجرم کے ساتھ ہمیں ویسا ہی سلوک کرنا چاہیے جیسا سلوک ہم طاعون کے مریض کے ساتھ کرتے ہیں۔ مجرم اور طاعون کا مرض دونوں عوام کے لیے خطرناک ہوتے ہیں۔ لہذا جب تک وہ خطرہ بنے رہیں، ان کی آزادی کو محدود کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ طاعون کے ساتھ ہم ہمدردی اور غمگشی سے پیش آتے ہیں جب کہ مجرم سے نفرت کرتے ہیں۔ یہ غیر معقول انداز ہے۔ اس رویے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہپتال مریضوں کے علاج میں زیادہ کامیاب ہیں جب کہ ہماری جیلیں مجرمانہ رویوں کی روک تھام میں بُری طرح ناکام ہو گئی ہیں۔

انفرادی اور سماجی نجات:

روایتی مذہب کی ایک خامی اُس کی انفرادیت پسندی ہے اور یہ خامی روایتی مذہب سے وابستہ اخلاقی نظام میں بھی پائی جاتی ہے۔ روایتی طور پر مذہبی زندگی روح اور خدا کے درمیان ایک مکالمہ تھی۔ خدا کے ارادے کی اطاعت نیکی خیال کی جاتی تھی اور فرد معاشرے میں لاتعلق ہو کر نیکی حاصل کر سکتا تھا۔ پروٹستنٹ فرقوں نے ”نجات کی تلاش“ کے تصور کو فروغ دیا لیکن مسیحی تعلیمات میں نجات پہلے سے موجود تھی۔ تاریخ کے بعض ادوار میں جدا گانہ فروغ دیا لیکن مسیحی تعلیمات میں نجات پہلے سے موجود تھی۔ تاریخ کے بعض ادوار میں جدا گانہ روح کی اس انفرادیت پسندی کی اپنی قدر و قیمت تھی لیکن دنیا کے جدید میں ہمیں فلاں کے انفرادی تصور کے بجائے اجتماعی تصور کی حاجت ہے۔ یہاں ہم

دیکھیں گے کہ اچھی زندگی کے ہمارے تصور کو یہ خیال کس طرح متاثر کرتا ہے۔ عیسائیت کا ظہور سلطنت روما کی ان آبادیوں میں ہوا جو سیاسی قوت سے مکمل طور پر محروم تھیں اور جن کی قومی ریاستوں کو تباہ و بر باد کر کے انہیں ایک وسیع و عریض غیر شخصی مجموعے میں ضم کر دیا گیا تھا۔ مسیحی عہد کی پہلی تین صدیوں کے دوران عیسائیت قبول کرنے والے لوگ ایسے سماجی اور سیاسی اداروں کے ماتحت زندگی گزارنے پر مجبور تھے جن کو وہ دل کی گہرائیوں سے بُرا سمجھتے تھے، لیکن ان کو تبدیل کرنے کی قدرت نہ رکھتے تھے۔ اس قسم کے حالات میں اس یقین کا پیدا ہونا فطری امر تھا کہ فرد غیر کامل دنیا میں بھی کمال حاصل کر سکتا ہے اور یہ کہ اچھی زندگی کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے برخلاف جب افلاطون نے اچھی زندگی کو بیان کرنا چاہا تھا تو اُس نے محض فرد کو ہی نہیں پورے گروہ کو پیش نظر کھا تھا۔ اُس نے یہ نقطہ نظر انصاف کی وضاحت کے لیے اختیار کیا تھا جو کہ بنیادی طور پر ایک سماجی تصور ہے۔ وہ ایک جمہوریہ کی شہرت کا عادی تھا اور سیاسی ذمہ داری کا تصور اُس کے لئے بالکل فطری تھا۔ یونانی آزادی کے زوال پر رواقت کو فروع ملا جو عیسائیت کی طرح، لیکن افلاطون کے برخلاف، اچھی زندگی کے انفرادیت پسند تصور پر یقین رکھتی تھی۔

ہم لوگ جمہوری نظاموں میں زندگی گزار رہے ہیں لہذا ہمیں روم کے آمرانہ سامراج کے مقابلے میں آزاد ایقونٹر میں زیادہ موزوں اخلاقیات دکھائی دیتی چاہیے۔ ہندوستان میں چند برس پہلے تک حالات حضرت عیسیٰ کے زمانے کے شہر جو ڈیا سے مختلف نہ تھے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں مہاتما گاندھی حضرت عیسیٰ سے ملتی جلتی اخلاقی اقدار کا چرچا کر رہے تھے لیکن ہندوستان کے زیادہ انہا پسند قوم پرست انفرادی نجات سے زیادہ مسلمان نہ تھے۔ وہ قومی نجات کے طلب گار تھے۔ اس ٹھمن میں انہوں نے مغرب کی آزاد جمہوریتوں سے نقطہ نظر حاصل کیا تھا۔ میں بعض پہلوؤں کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جن میں مسیحی اثرات کے باعث یہ نقطہ نظر فی الحال زیادہ جرأت مندا نہ اور خود آگاہ نہیں بلکہ اُس میں انفرادی نجات میں ایمان کا شاپہ موجود ہے۔

جس انداز میں ہم اچھی زندگی کو دیکھتے ہیں، اُس کے لئے بہت سے سماجی حالات درکار ہیں اور ان حالات کی عدم موجودگی میں وہ زندگی وجود میں نہیں آسکتی۔

ابھی ہم نے کہا تھا کہ اچھی زندگی محبت سے فیضان حاصل کرتی ہے اور علم سے رہنمائی۔ مطلوبہ علم صرف اُس وقت حاصل ہو سکتا ہے کہ جب حکومتیں اور اہل زر علم کی دریافت اور اشاعت میں دلچسپی لیں۔ مثال کے طور پر سرطان کی بیماری خطرناک انداز میں پھیل رہی ہے۔ ہم اس بارے میں کیا کر سکتے ہیں؟ علم کی کمی کے سبب کوئی شخص بھی فی الحال اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ اب جہاں تک علم کا تعلق ہے وہ تحقیق کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتا ہے اور اس کے لیے رقوم کی ضرورت ہوتی ہے۔ مزید برآں سائنس، تاریخ، ادب اور آرٹ کا علم ہر خواہش مند کے لئے قابل حصول ہونا چاہیے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ حکام و سیچ پیانے پر انتظامات کریں۔ مذہبی طور طریقوں سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح یہ ورنی تجارت کا مسئلہ ہے جس کے بغیر برطانیہ کی آدمی آبادی بھوکی مرنے لگے گی۔ جب کھانے کو روٹی نصیب نہ ہو تو ہم میں سے چند لوگ ہی اچھی زندگی بر کر سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی مثالوں کا ڈھیر لگانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کہنے کی اصل بات یہ ہے کہ یہ دنیا ایک وحدت ہے اور جو شخص اپنے طور پر آزادانہ زندگی بس کرنے کا مدعی ہے، وہ شعوری لاشعوری طور پر طفیل ہے۔

انفرادی نجات کے تصور سے ابتدائی دور کے مسیحی اپنی سیاسی غلامی کی تسلیم کیا کرتے تھے۔ جو نہیں ہم اچھی زندگی کے بے نگ تصور کی حدود سے نکلتے ہیں تو یہ تصور محال ہو جاتا ہے۔ رائج العقیدہ مسیحی تصور کے مطابق اچھی زندگی سے مراد نیک زندگی ہے اور نیکی کا مطلب خدا کے حکم کی تعمیل ہے اور خدا ہر فرد کو اس کے ضمیر کے ذریعے اپنے حکم سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ سارا تصور ہی ان لوگوں کا ہے جو کسی اجنبی آمریت کے پنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اچھی زندگی محسن نیک زندگی نہیں، نیکی کے علاوہ اُس میں اور کئی چیزوں، مثلاً ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب جہاں تک ضمیر کا تعلق ہے وہ قابل اعتبار رہنمائیں، کیونکہ ضمیر ابتدائی شباب میں سُنی ہوئی پند و نصائح کی مہم یادوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس لئے کسی شخص کا ضمیر اُس کی نرس یا ماں سے زیادہ دانا کبھی نہیں ہوتا۔

صحیح معنوں میں اچھی زندگی بس کرنے کے لئے آدمی کو اچھی تعلیم، دوستوں، محبت، بچوں (بشرطیکہ اُسے ان کی خواہش ہو) معقول آمدنی (تاکہ وہ نگ دستی اور شدید پریشانیوں سے محفوظ رہے)، اچھی سخت اور دلچسپ کام کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تمام اشیا

کسی نہ کسی حد تک معاشرے پر انحصار رکھتی ہیں اور سیاسی واقعات ان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اچھی زندگی اچھے معاشرے میں ہی بسر ہو سکتی ہے۔ اچھا معاشرہ میسر نہ ہو تو پھر اچھی زندگی کو پورے طور پر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

یہ اشرافی آدروش کی بنیادی خامی ہے۔ آرٹ، سائنس اور دوستی جیسی بعض چیزیں اشرافی معاشرے میں خوب پھول سکتی ہیں۔ یونان میں غلامی کے نظام کے باعث وہ موجود تھیں جب کہ برطانیہ میں وہ استھان کے سبب وجود رکھتی ہیں۔ لیکن اشرافی معاشرے میں ہمدردی آزادی سے فروغ نہیں پاسکتی۔ جاگیردار اپنے آپ کو یہ یقین دلانے پر مجبور ہوتا ہے کہ غلام، مزدور یا رنگ دار آدمی گھٹیا قسم کی مٹی سے بنا ہوا ہے اور اس کے دکھوں اور مصیبتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ برطانوی نوآبادیوں میں انگریز شرفا کا لون کو اس بُری طرح پیٹتے ہیں کہ ناقابل بیان اذیت کے چند گھنٹوں کے بعد وہ دم توڑ دیتے ہیں۔ اب اگر یہ انگریز شرفا اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب اور گفتگو کے ماہر ہوں تو بھی میں یہ تعلیم نہیں کر سکتا کہ وہ اچھی زندگی لسکر کر رہے ہیں۔ انسانی فطرت ہمدردی کی بعض حدود کا تین کرتی ہے، لیکن اس قدر نہیں، جمہوری رو یہ رکھنے والے معاشرے میں صرف کوئی دیوانہ ہی اس قسم کا سلوک کر سکتا ہے۔ اشرافی آدروش میں شامل ہمدردی کی حدود اس کی علامت ہے۔ نجات ایک اشرافی آدروش ہے کیونکہ یہ انفرادیت پسندانہ ہے۔ اس وجہ سے بھی انفرادی نجات کے تصور کی آپ جو بھی تعبیر کریں اور جتنی بھی اُسے وسعت عطا کریں، وہ اچھی زندگی کی تعریف میں کام نہیں آسکتا۔

نجات کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ ناگہانی تبدیلی سے بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ جیسے سینٹ پال کی طرف سے عیسائیت قبول کر لینا۔ شیلے کی نظمیں معاشرے پر اس تصور کے اطلاق کی مثال فراہم کرتی ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ شاعر ایک غیر اہم شخص ہوتا ہے جس کے خیالات کوئی اہمیت نہیں رکھتے لیکن میرے نزدیک انقلابی رہنماؤں کی بڑی تعداد شیلے سے ملتے جلتے خیالات کی حامل رہی ہے۔ یہ لیدر خیال کرتے رہے ہیں کہ دکھ، ظلم اور گروہ کا سبب آمر، پادری اور سرمایہ دار ہیں اور یہ کہ اگر بدی کے ان منابع پر قابو پالی جائے تو دلوں میں بھی ایک عام تبدیلی پیدا ہو جائے گی اور انسان ٹھیک خوشی زندگی بسر کرنے لگیں گے۔ اس قسم کے خیالات کے سبب انقلابی لیدر ”جنگ کے خاتمے کے لئے

جگ کرنے، پر آمادہ رہے ہیں۔ اس جدوجہد میں ناکام رہنے والے یا پھر جانیں قربان کرنے والے انقلابی نبٹا خوش نصیب رہے ہیں کیونکہ بدقسمی سے جوان انقلابی کا میاب ہو جاتے ہیں انہیں اپنے خوابوں کے ٹوٹنے کی اذیت سے گزرنا پڑتا ہے۔

میں یہ کہنے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا کہ انقلاب کبھی بھی ضروری نہیں ہوتے لیکن میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ امن اور خوشی کی دنیا تک جانے کے آسان راستے موجود نہیں ہیں۔ اسی طرح انفرادی یا اجتماعی اچھی زندگی تک رسائی کے لیے بھی آسان راستے موجود نہیں ہیں۔ اچھی زندگی تک رسائی کے لیے ہمیں ذہانت، ضبط نفس اور ہمدردی کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک کمیتی معاملہ ہے، بذریعہ ترقی، ابتدائی تربیت اور تعلیمی تجربے کا معاملہ ہے۔ بے صبری ہی اچانک ترقی کے امکان میں یقین پیدا کرتی ہے۔ ممکنہ بذریعہ ترقی اور اس کے حصول کے طریقے مستقبل کی سائنس کا معاملہ ہیں البتہ اس وقت بھی کچھ نہ کچھ تو کہا جا سکتا ہے الہذا میں اس مضمون کے آخری حصے میں اس پر کچھ کہنے کی کوشش کروں گا۔

سائنس اور مسرت:

معلم اخلاق کا مقصد انسانوں کے کردار کو بہتر بنانا ہوتا ہے۔ یہ قابل تعریف خواہش ہے، کیونکہ اکثر اوقات انسانوں کا کردار افسوسناک ہوتا ہے۔ تاہم میں معلم اخلاق کی تعریف اس کے مقاصد یا ان مقاصد کے حصول کے لیے اختیار کیے جانے والے طریقوں کے سبب نہیں کر سکتا۔ اس کا ظاہری طریقہ اخلاقی نصیحت ہے اور اگر وہ رائج العقیدہ ہے تو اس کا حقیقی طریقہ کارمعاشی جزا اوس اکیک نظام ہے۔ اخلاقی پندو عواظ سے کوئی مستقبل یا قابل ذکر نتیجہ پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اجیا پسندوں کے اثرات بہت ہی عارضی ثابت ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ کسی مرد کو مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ نیم مستقل داشتہ رکھنے کی بجائے وقتی طوائف پر قناعت کرے، کیونکہ اس کے لئے ایسا طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے جس کو سب سے زیادہ آسانی کے ساتھ چھپایا جاسکے۔ اس طرح طوائفوں کو فائدہ پہنچا ہے اور وہ جنسی امراض پھیلانے لگی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ نتیجہ نہیں جو معلم اخلاق چاہتا ہے لیکن اس کا ذہن اس قدر غیر سائنسی ہے کہ وہ دیکھ ہی نہیں

سلتا کہ اس کی کوششیں کیا پھل لارہی ہیں۔

کیا کوئی ایسی بہتر شے ہے جو پند و عظا اور رشوت کے اس غیر سامنی آمیزہ کی گد لے سکے؟ میرے خیال میں ایسی شے موجود ہے۔

انسانوں کے افعال جہالت یا بڑی خواہشوں کے سبب نقصان دہ ہوتے ہیں۔

جب ہم سماجی نقطہ نظر سے بڑی خواہشوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد ایسی خواہش ہو سکتی ہیں جو دوسروں کی خواہشوں کی راہ روکتی ہے۔ زیادہ صراحت سے یوں کہیے کہ بڑی خواہشوں سے مراد ایسی خواہشیں ہیں جو زیادہ خواہشوں کی مزاحمت کرتی ہیں اور کم خواہشوں کی مددگار ہوتی ہیں۔ جہالت سے پیدا ہونے والے مضر اثرات پر تفصیل سے بات کرنا ضروری نہیں۔ یہاں ہم زیادہ علم کی وکالت کر رہے ہیں کیونکہ ترقی کی راہ زیادہ تحقیق اور زیادہ تعلیم سے نکلی ہے، البتہ بڑی خواہشوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والا نقصان زیادہ مشکل مسئلہ ہے۔

عام عورتوں اور مردوں میں ایک خاص حد تک فعال بدخواہی موجود ہوتی ہے۔

اس کا رخ خاص دشمنوں اور دوسروں کی تکلیف سے خوش ہونے کی طرف ہوتا ہے۔ اس پر عموماً اچھے اپنے جملوں کا پرده ڈال دیا جاتا ہے۔ تقریباً آدمی روایتی اخلاقیات اس پر دے کا کام دیتی ہے لیکن اگر مصلحین ہمارے کردار میں بھلائی پیدا کرنے کے مقصد میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو پھر اس پوشیدہ بدخواہی کے وجود کو تسلیم کرنا ہو گا۔ اس کا اظہار ہزاروں انداز میں ہوتا ہے۔ لوگ جس خوشی سے سکینڈل دہراتے ہیں یا ان پر یقین کرتے ہیں، اس میں اس بدخواہی کی بھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ اس بھلک کو مجرموں کے ساتھ بے رحم سلوک میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ حالانکہ بے رحم سلوک کرنے والوں کو معمول ہوتا ہے کہ اگر مجرموں سے بہتر سلوک کیا جائے تو ان کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اس طرح کالوں کے ساتھ گوروں کے برتاو میں بھی اس انسانی بدخواہی کو کارفرماد دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں تک کہ بچوں کو بھی خواہخواہ کے ظلم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ افسانوی کردار کو پر فیلڈ اور اولیور ٹو سٹ مخفی تخلیل کی پیداوار نہیں ہیں۔ یہ فعال بدخواہی انسانی فطرت کا بذریں غنیر ہے اور دنیا کو زیادہ خوش باش بنانے کے لیے اس غنیر کو بدلتا بے حد ضروری ہے۔ غالباً یہ بدخواہی تمام معاشی اور سیاسی اسباب سے زیادہ جنگلوں کا سبب رہی ہے۔

اچھا تو آئیے ہم دیکھتے ہیں کہ بدخواہی کے اس مسئلے سے ہم کس طرح نمٹ سکتے ہیں۔ پہلے ہم اس کے اسباب سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ اسباب جزوی طور پر سماجی اور جزوی طور پر نفیسیاتی ہیں۔ پہلے ادوار کی طرح آج کی دنیا کی اساس بھی زندگی اور موت کی مسابقت پر ہے۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم میں ہم دیکھتے ہیں کہ مسئلے یہ تھا کہ آیا جرمنوں کے بچے بھوک اور احتیاج سے مرنے چاہئیں یا اتحادیوں کے؟ (مانا کے طرفیں بدخواہی پر اترے ہوئے تھے پھر بھی اس امر کا کوئی معمولی سا سبب بھی موجود نہ تھا کہ وہ زندہ کیوں نہ رہیں) اکثر لوگوں کے ذہنوں میں تباہی کا خوف موجود رہتا ہے۔ خاص طور پر صاحب اولاد لوگ اس خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ امیروں کو دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کیونٹ ان کے مال و ممکن اپر قابض ہو جائیں گے۔ غریبوں کو اپنی نوکریوں کا یا پھر صحت کا ڈر رہتا ہے۔ ہر کوئی دیوانہ و ارتھظٹ کا مبتلاشی ہے اور سمجھتا ہے کہ امکانی دشمنوں کو قابو میں رکھ کر اسے تحفظ مل سکتا ہے۔ افراتفری کے عالم میں ظلم و سفا کی کا چلن عام ہو جاتا ہے اور بدترین بھی۔ ہر جگہ رجعت پسند خوف پھیلاتے رہتے ہیں۔ برطانیہ میں کیونزم کا، فرانس میں جرمنوں کا اور جرمنی میں فرانس کا خوف عام کرتے رہتے ہیں۔ ان کی کوششوں کا واحد نتیجہ یہ ہے کہ جس شے سے وہ تحفظ چاہتے ہیں، اس کے خلاف خطرہ بڑھتا جاتا ہے۔

اس صورت حال میں سائنسی معلم اخلاق کو خوف سے نمٹنے پر زیادہ توجہ دینا چاہیے۔ یہ کام دو طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ تحفظ و سلامتی میں اضافہ کیا جائے اور دوسری یہ کہ جرأت پیدا کی جائے۔ یاد رہے کہ یہاں خوف سے میری مراد کسی ممکنہ بد قسمتی کی معقول پیش بینی نہیں غیر معقول جذبے کی حیثیت سے خوف ہے۔ مثلاً جب کسی تھیٹر میں آگ لگ جاتی ہے تو کوئی معقول شخص بھی اسی طرح خطرے سے آگاہ ہو جاتا ہے جس طرح افراتفری کا شکار ہو جانے والا کوئی اور شخص۔ لیکن اس صورت حال میں معقول شخص ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جن کی مدد سے اس مصیبت پر قابو پایا جاسکے۔ جب کہ دوسرا شخص افراتفری کے عالم میں مصیبت میں اضافے کا سبب بن جاتا ہے۔ ترقی اور خوش حالی کے لئے خوف کے بجائے امید کی ضرورت ہوتی ہے۔ وکٹورین زمانے میں برطانیہ میں اس لئے تیزی سے ترقی ہوئی کہ لوگ خوف کے بجائے امید کا دامن تھا۔

ہوئے تھے۔ اب اگر ہمیں دوبارہ ترقی کرنی ہے تو پھر سے امید سے ناطہ جوڑنا ہو گا۔ عمومی تحفظ میں اضافہ کرنے والی ہر شے تشدیم کرنے میں مددگار ہو سکتی ہے، جنگوں کی روک تھام بھی اس طریقے سے ممکن ہے۔ افلاس و محتاجی کی روک تھام میں بھی ہم اس طریقے سے کام لے سکتے ہیں۔ طب اور صحت و صفائی کے امور میں ترقی کے ذریعے صحت عامہ کا معیار بلند کیا جا سکتا ہے۔ اصل میں ان تمام دہشتوں کو کم کیا جا سکتا ہے جو ہمیں خوف میں بنتا رکھتی ہیں اور زندگی میں ہمیں سکھ کا سانس نہیں لینے دیتیں لیکن اگر نسل انسانی کے ایک حصے کی قیمت پر دوسرے حصے کو تحفظ و سلامتی مہیا کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے اچھے نتائج پیدا نہیں ہو سکتے۔ ہم جرمنوں کی قیمت پر فرانسیسیوں کو، محنت کشوں کے کاندھوں پر سرمایہ داروں کو اور زرنسل کی قیمت پر سفید فام نسل کو سلامتی مہیا نہیں کر سکتے۔ اس قسم کی کاوشوں سے الٹ نتائج پیدا ہوتے ہیں اور غالب گروہ میں خوف و دہشت بڑھ جاتی ہے، کیونکہ اُسے زیر دستوں کی طرف سے بغاوت کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ گویا تحفظ صرف انصاف کے ذریعہ مل سکتا ہے اور انصاف سے میری مراد تمام انسانوں کے مساوی حقوق کو تنقیم کرنا ہے۔

خوف کے خاتمے کے لیے درکار سماجی تبدیلیوں کے علاوہ خوف کے خاتمے کا ایک اور براہ راست طریقہ بھی ہے اور وہ ہے جرأت و حوصلے میں اضافے کا طریقہ۔ جنگوں میں چونکہ جرأت کی بہت ضرورت ہوتی ہے، لہذا ابتدائی زمانے ہی میں تعلیم اور خوراک کے ذریعہ جرأت مندی میں اضافے کے طریقے دریافت کر لئے گئے تھے۔ مثلاً پرانے زمانے میں سمجھا جاتا تھا کہ انسانی گوشت کھانے سے جرأت بڑھ جاتی ہے۔ تاہم فوجی جرأت صرف حکمران طبقے کا استحقاق تھی۔ چنانچہ قدیم یونان میں سپارٹا کے آزاد سپاہیوں کو غلام سپاہیوں کے مقابلے میں زیادہ جری سمجھا جاتا تھا۔ برطانوی ہند کی فوج میں انگریز سپاہیوں کو دیسی سپاہیوں کے مقابلے میں زیادہ جرأت مند خیال کیا جاتا تھا۔ اس طرح عورتوں کے مقابلے میں مردوں کو بہادر تصور کیا جاتا ہے۔ اس صورت حال میں ہوتا یہ ہے کہ حکمران طبقے کی جرأت میں ہر اضافے کو زیر دستوں کا بوجھ بڑھانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ گویا اس سے حاکموں کا خوف بھی بڑھ جاتا ہے، ظلم اور بے رحمی کے اسباب اپنی جگہ موجود رہتے ہیں۔ انسانوں کو شائستہ اور شفیق بنانے کے لیے جرأت مندی

کو جمہوری رنگی دینا ضروری ہے۔

یہاں یہ امر مقابل ذکر ہے کہ حالیہ واقعات نے پہلے ہی جرأت مندی کو خاصی حد تک عام کر دیا ہے۔ مثلاً حق رائے دہی طلب کرنے والی عورتوں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ جرأت مندی میں بہادر ترین مردوں سے پچھنہیں۔ رائے دہی کا حق حاصل کرنے کے لئے جرأت مندی کا یہ مظاہرہ ضروری تھا۔ دوسری جنگ عظیم کی صورت حال یہ تھی کہ اس میں سپاہی کو کیپٹن یا لیفٹینٹ سے زیادہ اور جزل سے تو کہیں زیادہ جرأت کی ضرورت تھی۔ جن کمیونٹیوں نے روس میں انقلاب برپا کیا، ان کے بارے میں آپ جو بھی کہیں لیکن انہیں بزدل نہیں کہا جاسکتا۔ انقلاب سے پہلے کاریکار ڈیکھتے ہیں کہ گزشتہ نصف صدی کے دوران ایسے کئی واقعات رونما ہوئے ہیں جنہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ ماضی کی طرح اب جرأت مندی پر اشرا فیکی اجارہ داری نہیں رہی۔

لڑائی جنگلے میں جس جرأت کا اظہار ہوتا ہے وہ جرأت مندی کی واحد صورت نہیں، شاید اسے اہم ترین صورت بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ غربت کا مقابلہ کرنے، تمسخر کا مقابلہ کرنے اور اپنے ہی گروہ کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنے میں بھی جرأت مندی ہوتی ہے۔ یہ ایسے میدان ہیں جن میں دلیر ترین سپاہی بھی اکثر اوقات افسوناک حد تک بزدل ثابت ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خطرے کی حالت میں ٹھنڈے دل اور عقل و فہم سے کام لینا اور افراد افری اور یہجان کی ترکوں پر قابو رکھنا بھی جرأت مندی کا تقاضا کرتا ہے۔ بلاشبہ یہ ایسے امور ہیں جن میں تعلیم سے مددی جاسکتی ہے۔ اب اگر صحت اچھی ہو، جسم تدرست ہو، مناسب خوراک میسر ہو اور بیمادی حیاتی جبتوں کو اظہار کے آزادانہ موقع میسر ہوں تو پھر جرأت مندی کی ہر صورت کا درس دینا زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ جرأت کے جسمانی وسائل کو غالباً یوں بھی دریافت کیا جاسکتا ہے کہ کسی خرگوش کے خوف کا مقابلہ بلی کے خوف سے کیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ سامنے جرأت مندی میں اضافے کے سلسلے میں بہت مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ (جیسے اچھی خوراک، اچھی صحت، ایڈو پچ، کھلیل وغیرہ) وہ بالائی طبقے کے نوجوانوں کو خاصی حد تک حاصل ہوتی ہیں۔ غریب لوگ ان سے محروم ہوتے ہیں، لیکن ضرورت ان کو بھی حوصلہ اور شکتی عطا کر دیتی ہے۔ تاہم

غیر طبقوں کے نوجوان پیش قدیمی اور قیادت کے لئے درکار حوصلے عموماً محروم رہ جاتے ہیں۔ اگر وہ صفات عام ہو جائیں جو قیادت کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں تو پھر قائد اور مقلد نہ رہیں گے اور جمہوریت کی تکمیل ہو جائے گی۔

خیر، اس حقیقت کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ بدخاہی صرف خوف سے پیدا نہیں ہوتی۔ بدخاہی پیدا کرنے میں حسد اور مایوسی کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے لوگوں میں عموماً بدخاہی کا عصر زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی عورت یا مرد کو جسی طور پر غیر مطمئن رکھا جائے تو اس میں حسد کا جذبہ بڑھ جاتا ہے۔ عموماً اس کا انداز یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ فرد زیادہ خوش قسمت لوگوں پر اخلاقی حوالہ سے نکتہ چینی کرنے لگتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انقلابی تحریکوں کی زیادہ تر قوت محکمہ امراء کے خلاف حسد سے پیدا ہوتی ہے۔ رقبت حسد کی ایک خاص صورت ہے جو محبت کے معاملے میں پیدا ہوتی ہے۔ عمر سیدہ لوگ عموماً نوجوانوں سے حسد کرتے ہیں۔ اس صورت میں وہ نوجوانوں کے ساتھ بے رحمی سے پیش آنے لگتے ہیں۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے، حسد سے نہنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ حاسد لوگوں کی زندگی کو زیادہ خوش گوار اور بھرپور بنایا جائے اور نوجوانوں کو مسابقت کے بجائے مشترکہ مہم جوئی کا درس دیا جائے۔ بدترین قسم کا حسد ان لوگوں میں پایا جاتا ہے جو شادی، بچوں یا کیریئر کے معاملے میں کامیابیاں حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ بہتر سماجی اداروں کی صورت میں ان بد قسمتیوں سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔ خیر اس کے باوجود حسد کا کوئی نہ کوئی عصر باقی رہے ہی جائے گا۔ تاریخ میں ایک دوسرے کے ساتھ حسد کرنے والے ایسے جریلوں کی کئی مثالیں ملتی ہیں جنہوں نے دوسرے کی شہرت داغدار کرنے کی خاطر شکست کو گلے لگایا۔ ایک ہی پارٹی کے دو سیاست دانوں یا ایک ہی سکول کے دو فن کاروں میں ایک دوسرے کے خلاف حسد کا پیدا ہونا کم و بیش تینی امر ہے۔ ان صورتوں میں اس کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو جریلوں کو ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے سے دور کھا جائے اور ایسا انتظام کیا جائے کہ وہ صرف بہتر صلاحیت کی بنا پر جیت سکیں۔ ایک فن کار کا دوسرے فن کار سے حسد عموماً کم نقصان دہ ہوتا ہے، کیونکہ اس کے حوالے سے فن کار کو اپنے حریف سے بہتر فن کار انہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا پڑتا

ہے۔ جہاں کہیں حد سے چھکارا ممکن نہ ہو، وہاں اسے حریفوں کی کاوشوں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے بجائے اپنی صلاحیتوں کو نکھرانے کے لئے استعمال کرنا چاہیے۔ انسانی مسروتوں میں اضافہ کرنے سے متعلق سائنس کے امکانات انسانی فطرت کے ان پہلوؤں کو ختم کرنے تک محدود نہیں جو انسانوں کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور اس لئے ہم انہیں ”بُرا“، قرار دیتے ہیں۔ ثبت فضیلت کو بڑھانے میں سائنس غالباً لامحدود کردار ادا کر سکتی ہے۔ اُس نے پہلے ہی صحت کی صورت حال کو بڑی حد تک بہتر بنا دیا ہے۔ ماضی پرستوں کے مرثیوں کے باوجود اب ہم زیادہ عرصے تک زندہ رہتے ہیں اور ماضی کے مقابلے میں اب بیکاریاں بھی کم ہو گئی ہیں۔ جو علم ہمارے پاس موجود ہے، اس کے کسی قدر زیادہ اطلاق کی صورت میں ہماری صحت مزید اچھی ہو سکتی ہے۔ ہم یقین کر سکتے ہیں کہ مستقبل کی دریافتیں اس عمل کی رفتار بہت تیز کر دیں گی۔

اب تک طبعی سائنس نے ہماری زندگیوں کو زیادہ متاثر کیا ہے۔ تا ہم آئندہ علم اعضا اور نفیات غالباً زیادہ اثر انگیر ثابت ہوں گی۔ جب ہم اس حقیقت کو دریافت کر لیں گے کہ انسانی کردار عضویاتی کیفیات پر کس طرح مخصر ہوتا ہے تو پھر ہم زیادہ تعداد میں ایسے لوگ پیدا کر سکیں گے فن کارانہ صلاحیت اور ہمدردی جیسی صفات میں اضافہ کر سکتی ہے۔ اگر سائنس کو انسان دانش مندی سے بروئے کار لانے لگیں تو بہتر دنیا تغیر کرنے کے امکانات لامتناہی ہو جائیں گے۔ کسی اور جگہ میں اپنے ان خدشات کا اٹھا کر چکا ہوں کہ انسان سائنس سے حاصل ہونے والی قوت کو قلمبندی سے استعمال نہیں کر سکتے۔ یہاں میری دلچسپی اُس اچھائیوں سے ہے جو انسان اگر چاہیں تو پیدا کر سکتے ہیں۔ لہذا اس سوال کو نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہے کہ آیا انسان اچھائی کے بجائے برائی کا انتخاب کریں گے۔

انسانی زندگی پر سائنس کے اطلاق سے متعلق ایک روایہ ایسا ہے جس سے میں اتفاق تو نہیں کرتا، لیکن اُس سے تھوڑی بہت ہمدردی ضرور رکھتا ہوں۔ یہ اُن لوگوں کا روایہ ہے جو غیر فطری چیزوں سے خالف رہتے ہیں۔ یورپ میں روسو اس نقطہ نظر کا ایک نمایاں حامی ہے۔ ایشیا میں چوبیں صدیاں پہلے چینی فلسفی لاوزے نے اس نقطہ نظر کو زیادہ قائل کرنے والے انداز میں پیش کیا تھا۔ میرے نزدیک ”فطرت“ کی مدرج سرائی میں سچ اور جھوٹ ایک دوسرے میں ضم ہو گئے ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنا ضروری

ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ”فطرت“ سے کیا مراد ہے؟ سید ہے سادھے لفظوں میں یوں کہیے کہ اس سے مراد وہ سب کچھ ہے جس سے بات کرنے والا اپنے بچپن میں آشنا تھا۔ لاوز سے سڑکوں، گھوڑا گاڑیوں اور کشیوں پر اعتراض کرتا تھا۔ غالباً ان میں سے کوئی چیز بھی اُس گاؤں میں موجود نہ تھی جس میں لاوزے پیدا ہوا تھا۔ روسو چونکہ ان چیزوں کا عادی ہو چکا تھا، اس لئے وہ انہیں ضرور طوفان برپا کر دیتا۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لباس اور کھانے پکانے کا کام انسان چونکہ زمانہ قدیم سے کرتا چلا آ رہا ہے، اس لئے کوئی فطرت پرست ان کی مخالفت نہیں کرتا، البتہ وہ ان امور میں نئے رواجوں کی مذمت کرتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں ایسے لوگ ہیں جو تجربہ کو قبول کر لیتے ہیں لیکن برتحک کنٹرول کو رہا سمجھتے ہیں۔ وجہ بس یہ ہے کہ تجربہ کا رواج پرانے زمانے سے چلا آتا ہے جب کہ برتحک کنٹرول ایک نیا رہنمائی ہے۔ ان سارے معاملات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ”فطرت“ کا درس دینے والوں میں ہم آہنگی اور استقلال موجود نہیں۔ ہم انہیں محض قدمت پرست قرار دے سکتے ہیں۔

خیر اس کے باوجود فطرت پرستوں کے حق میں بھی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ منزلہ کی مثال لیجئے جن کی دریافت نے ”فطرتی“ اشیائے خوردنی کے بارے میں ناگواری سی پیدا کر دی ہے۔ تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ وہ منزلہ بھلی کی روشنی کا کاڈیور آئیل سے بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں، حالانکہ یہ دونوں اشیاء انسانوں کی ”فطری“ خوراک میں شامل نہیں ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علم کی غیر موجودگی میں فطرت سے کی جانے والی کوئی نئی علیحدگی غیر متوقع نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔ البتہ جب نقصان کا فہم حاصل ہو جائے تو پھر کسی نئی مصنوعی شے سے اُس کا علاج بھی کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک ہمارے طبعی ماحول اور ہماری خواہشوں کی تسلیکیں کے طبق ذراائع کا تعلق ہے، میر انہیں خیال کہ فطرت کا نظریہ نئی مصلحتوں کو اختیار کرنے کے معاملے میں ایک خاص تجرباتی احتیاط سے زیادہ کسی شے کو جائز نہیں ہے۔ مثال کے طور پر لباس غیر فطری ضرورت ہے اور وہ ایک غیر فطری عمل یعنی کپڑے دھونے کی ضرورت پیدا کر دیتا ہے۔۔۔ بشرطیکہ ہم کپڑوں کو بیماری کا سبب نہ بنانا چاہتے ہوں، لیکن یہ دونوں غیر فطری کام، یعنی کپڑے پہننا اور انہیں صاف سترے رکھنا، مل کر آدمی کو اُس وحشی سے زیادہ صحت مند بنادیتے ہیں جو ان کا مول کو پسند

نہیں کرتا۔

انسانی خواہشوں کے ضمن میں ”فطرت“ کے حق میں اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مردوں، عورتوں اور بچوں پر اُن کے شدید ترین جذبوں کی مزاحمت کرنے والی زندگی مسلط کرنا نہ صرف ظلم ہے بلکہ خطرناک بھی ہے۔ اس مفہوم میں ”فطرت“ سے ہم آہنگ زندگی کو بعض شرائط کے ساتھ قابل تعریف سمجھنا چاہیے۔ بھلی کی زیریز میں ریلوے سے زیادہ مصنوعی شے اور کیا ہو سکتی ہے، لیکن جب کسی بچے کو اس ریلوے کے ذریعے سفر کروایا جائے تو اُس کی فطرت کو کوئی ضعف نہیں پہنچتا۔ اس کے بر عکس کم و بیش تمام بچے ایسی ریل میں سفر کر کے خوش ہوتے ہیں۔ اگر وہ کوئی فرق نہ ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ عام انسان کی خواہشوں کو تسلیم دینے والی مصنوعی اشیا اچھی ہوتی ہیں۔ لیکن ان انداز ہائے زندگی کے بارے میں ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے جو اس لحاظ سے مصنوعی ہوتے ہیں کہ ہم انہیں منتخب نہیں کرتے بلکہ اتحاری یا معاشری ضرورت انہیں ہمارے اوپر مسلط کر دیتی ہے۔ بلاشبہ آج کے زمانے میں زندگی کے اس قسم کے اسلوب کسی حد تک ضروری ہیں لیکن اس قسم کی مجبوریاں افسوس ناک ہیں اور ہمیں ان سے بچنے کے طریقے تلاش کرنے چاہئیں۔ تھوڑی بہت محنت ایسی چیز نہیں کہ جس کی شکایت کی جائے بلکہ دس میں سے نو صورتوں میں خاص حد تک محنت مکمل کا ہلکی کے مقابلے میں انسان کو خوشی عطا کرتی ہے لیکن آج کے دور میں اکثر لوگوں کو جس قدر اور جس قسم کی محنت کرنا پڑتی ہے، وہ میقیناً گبی پھر قسم کی برائی ہے۔ زندگی بھر کی روئین کی غلامی خاص طور پر قابل مذمت ہے۔ زندگی کو قاعدوں اور راضا بطور کی زنجیروں میں حکڑا ہوانہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہماری خواہشیں اگر دوسروں کے لیے تباہ کن اور خطرناک نہ ہوں تو پھر انہیں آزادانہ اظہار کا موقع ملنا چاہیے۔ مہم جوئی کے لیے زندگی کی گنجائش ہونی چاہیے۔ ہمیں انسانی فطرت کا احترام کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہمارے جذبے اور خواہش ہی وہ مواد ہیں جن سے مسرت کی تشكیل ہوتی ہے۔ انسانوں کو تجربیدی ”اچھائی“ سے بہلانا بے معنی سی بات ہے۔ اگر ہم ان کی خوشیوں میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو پھر انہیں وہ کچھ دینا ہوگا جس کے وہ خواہش مند ہیں، یا جس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ممکن ہے سائنس وقت کے ساتھ ہماری خواہشوں کی اس طرح صورت گری کرنے پر قادر ہو جائے کہ وہ آج کی طرح دوسرے لوگوں کی خواہشوں سے متصادم نہ

رہیں۔ تب ہم زمانہ حال کے مقابلے میں اپنی خواہشوں کے زیادہ حصے کی تسلیم کرنے کے مقابل ہو جائیں گے۔ پھر صرف اور صرف اس مفہوم میں ہماری خواہشیں بہتر ہو جائیں گی۔ علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو کوئی خواہش کسی دوسری خواہش سے بہتر نہیں ہوا کرتی۔ لیکن اگر خواہشوں کے دو گروپ ہوں جن میں سے پہلے گروپ میں شامل تمام خواہشوں کی بیک وقت تسلیم ممکن ہو جب کہ دوسرے گروپ میں بعض خواہشیں آپس میں متصادم ہوں تو ہم پہلے گروپ کی خواہشوں کو بہتر قرار دے سکتے ہیں۔ اسی لئے ہم محبت کو نفرت سے بہتر قرار دیتے ہیں۔

طبعی فطرت کا احترام کرنا احتمان کا ممکنہ حد تک میکیل کے حوالے سے طبی فطرت کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جہاں تک اخلاقی نقطہ نظر کا تعلق ہے، طبی فطرت اچھی ہے نہ بُری۔ جہاں کہیں طبی اور انسانی فطرتیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں، جیسا کہ مثلاً آبادی کے مطالعے میں ہوتا ہے، تو وہاں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر پیش جانا آبادی کے مسئلے سے منشی کے لئے جگ نہ کرنا اور مہک و باوں اور قحط کا انتظار کرنا بُھیک نہیں۔ مہبی لوگ آبادی پر کنٹرول کی مخالفت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آبادی میں اضافے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔ اگرچہ ان کی رائے کو کوئی شخص بھی زیادہ اہمیت نہیں دیتا، لیکن سوال یہ ہے کہ آبادی کے مسئلے کو طبی طریقوں کے ذریعے کیوں حل نہ کیا جائے؟ اس سوال کا اگر کوئی جواب دیا جاتا ہے تو وہ بھی بوسیدہ عقائد پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ مہبی لوگ فطرت کی جس خلاف ورزی کی وکالت کرتے ہیں وہ اتنی ہی شدید ہے جتنی بر تھ کنٹرول میں ہو سکتی ہے۔ مہبی لوگ انسانی فطرت پر اس تشدد کو ترجیح دیتے ہیں جس پر جب کامیابی سے عمل کیا جائے تو وہ رنجیدگی، حسد، ایذ اور انسانی کے رجحان اور اکثر اوقات جنون کو شامل حال رکھتا ہے۔ ان کے مقابلے میں طبی فطرت کے خلاف ایسے تشدد کو ترجیح دیتا ہوں جو دیسا ہی ہے جیسا سیم انجمن یا پھر چھتری کے استعمال میں شامل ہوتا ہے۔ یہ مثال اس امر کو اجاگر کر دیتی ہے کہ اس اصول کا اطلاق کس قدر بھم اور غیر لیکنی ہے کہ ہمیں ”فطرت“ کی پیروی کرنی چاہیے۔

”فطرت“ یہاں تک کہ انسانی فطرت بھی وقت کے ساتھ مطلق و اقمع کی حیثیت سے محروم ہوتی جائے گی اور وہ سائنس کے تقاضوں کے مطابق ڈھلتی جائے گی۔ سائنس

اگر چاہے تو وہ ہماری آئندہ نسلوں کو اچھی زندگی مہیا کر سکتی ہے۔ کیونکہ وہ انہیں علم و ضبط نفس اور فضاد کے بجائے ہم آہنگی کی صفات عطا کر سکتی ہے۔ تا ہم اس وقت صورت حال بالکل مختلف ہے اور سائنس ہمارے پیچوں کو ایک دوسرے کو قتل کرنے کا درس دے رہی ہے۔ اس رویے کا ایک سبب یہ ہے کہ بہت سے سائنس دان ہم اپنی خوش حالی کی خاطر نسل انسانی کو قربان کرنے پر آمادہ ہیں۔ تا ہم یہ مرحلہ اُس وقت ختم ہو جائے گا جب انسان اپنے جذبہ پر ویسا ہی غلبہ حاصل کر لیں گے جیسا غلبہ وہ خارجی دنیا کی قوتیں پر پہلے ہی حاصل کر چکے ہیں، تب آخر کار ہم اپنی آزادی سے بہرہ ور ہو سکیں گے۔

آزادی اور معاشرہ

یہاں میں اس مسئلے پر بحث کرنا چاہتا ہوں کہ معاشرے میں رہنے والے انسانوں کے لیے آزادی کس حد تک ممکن ہے اور کس حد تک پسندیدہ۔ شاید پہلے ہمیں آزادی کی تعریف پر توجہ دینا چاہیے۔ یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جس کو بہت سے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لہذا مفید استدلال کی خاطر ہمیں ان میں سے کسی ایک تعریف کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔ اس کے مقابلے میں معاشرہ (برادری) کسی قدر کم مہم اصطلاح ہے لیکن اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔

میرے خیال میں الفاظ کو قیاسی مفہوم میں استعمال کرنا پسندیدہ بات نہیں۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ جرمن فلسفی ہیگل اور اس کے مقلد سمجھتے ہیں کہ ”سچی“ آزادی پولیس کی فرمان بروداری کے حق سے عبارت ہے۔ وہ اسے عام طور پر اخلاقی قانون کا عنوان دیتے ہیں۔ اب اس میں شبہ نہیں کہ پولیس کو اپنے اعلیٰ حکام کا حکم ماننا چاہیے مگر اس تعریف سے ہمیں یہ پتہ چلتا کہ خود حکومت کے فرائض کیا ہیں۔ اس نقطہ نظر کو تسلیم کرنے والوں کا عملی طور پر استدلال یہ ہے کہ ریاست لازماً اور اپنی تعریف کے اعتبار سے بے خطا ہوتی ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ تعریف ان ملکوں کے حوالہ سے غیر موزوں ہے جن میں جمہوریت رائج ہے اور جماعتی حکومتیں قائم ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے ملک میں لگ بھگ آدمی قوم حکومت کو بدکار اور بد اعمال خیال کرتی ہے لہذا ہم ”سچی“ آزادی کو آزادی کے تبادل کے طور پر استعمال نہیں کر سکتے۔

انہائی تجربیدی مفہوم میں ”آزادی“ کا مطلب ہے خواہشوں کی تحریکیں میں بیرونی رکاوٹوں کی عدم موجودگی۔ اس تجربیدی مفہوم کے ہوائے سے قوت میں اضافہ کر کے یا پھر خواہشوں میں کمی کر کے آزادی میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اس تعریف کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کے دو چار روز گزار کر سردی سے مر جانے والا کیڑا اکمل آزادی سے ہمکنار ہوتا ہے، کیونکہ سردی اس کی خواہشوں کو یوں بدل دیتی ہے کہ اس کے

پاس محال کے حصول کی خواہش کے لیے کوئی لمحہ باقی نہیں رہتا۔ انسان بھی اس قسم کی آزادی تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اور یہ آرمی کمپیئر بن جانے والے ایک نوجوان روئی امیر نے مجھے بتایا تھا کہ رو سیوں کی طرح انگریزی کو جسمانی جکڑ بندی کی ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ ان کے ذہن اور روئی میں ہمیشہ اس قسم کی جکڑ بندیوں میں جکڑی رہتی ہیں۔ شاید اس بات میں تھوڑی بہت سچائی شامل ہے۔ بلاشبہ دستوں کی کردار حقیقی رو سیوں سے مختلف ہیں، لیکن وہ ایسے کردار ہیں جن کو ایک روئی ہی تخلیق کر سکتا تھا۔ وہ سب ایسی متشدد خواہشات کے حامل ہیں جن سے ایک عام انگریز، کم از کم جہاں تک اس کی شعوری زندگی کا تعلق ہے، آزاد ہوتا ہے۔ یہ امر بالکل واضح ہے کہ اگر کسی معاشرے کے تمام افراد ایک دوسرے کو قتل کرنے کی خواہش رکھتے ہوں تو پھر وہ اس معاشرے جتنا آزاد نہیں ہو سکتا جس کے ارکان زیادہ پر امن خواہشوں کے حامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خواہش کی ترمیم و اصلاح سے آزادی کو اتنا ہی فائدہ پہنچ سکتا ہے جتنا کہ قوت میں اضافے سے پہنچتا ہے۔

یہ امر ایک ایسی ضرورت کو واضح کرتا ہے جس کو سیاسی فکر میں اکثر اوقات نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ میری مراد اس شے سے ہے جس کو ہم ”نفیاتی حرکات“ کا عنوان دے سکتے ہیں۔ عام طور پر سیاسیات میں انسانی فطرت کو ایک ایسے مقولہ کے طور پر قبول کر لیا جاتا ہے جس سے خارجی حالات کو مطابقت اختیار کرنا ہوتی ہے۔ تاہم پھر بات یہ ہے کہ خارجی حالات انسانی فطرت پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اسے تبدیل کرتے ہیں اور یہ کہ ان دونوں کے درمیان، یعنی انسانی فطرت اور خارجی حالات کے درمیان ہم آہنگی باہمی تعامل کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر ہم کسی شخص کو ایک ماحول سے نکال کر اچانک دوسرے ماحول میں لے آئیں تو ہو سکتا ہے وہ آزادی سے بہرہ ورنہ ہو سکے، چاہیے وہ نیا ماحول ان لوگوں کو آزادی مہیا کرتا ہو جاؤں کے عادی ہیں۔ لہذا ہم تغیر پذیر ماحول کے زیر اثر پیدا ہونے والی مختلف خواہشوں کے امکان پر نگاہ رکھے بغیر آزادی کے مسئلے سے نہ رہ آ زمانیں ہو سکے۔ بعض صورتوں میں اس سے آزادی کا حصول مشکل تر ہو جاتا، کیونکہ نیا ماحول پر اپنی خواہشوں کی تسلیم کرنے کے باوجود ایسی نئی خواہشیں پیدا کر سکتا ہے جن کی تسلیم اس کے بس کاروگ نہ ہو۔ اس امکان کی وضاحت صنعت کاری کے

نسیاٹی اثرات سے کی جاسکتی ہے۔ صنعتی ترقی نئی ضرورتوں اور حاجتوں کو پروان چڑھاتی ہے۔ کوئی شخص مخفی اس لیے رنجیدہ ہو سکتا ہے کہ وہ موڑ کار نہیں خرید سکتا۔ جلد ہی ہم سب اپنا اپنا طیارہ بھی خریدنا چاہیں گے۔ یہی نہیں بلکہ کوئی شخص اپنی لاشوری ضروریات کے حوالے سے بھی رنجیدہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً امریکیوں کو آرام کی ضرورت ہے، لیکن وہ اس سے آگاہ نہیں ہیں۔ میرے خیال میں امریکہ میں جرائم کی اہمیت بڑی حد تک توجیہہ اسی بابت کے حوالے سے کی جاسکتی ہے۔

لوگوں کی خواہیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں لیکن بعض ایسی بنیادی ضرورتیں ہیں جن کو ہم کم و بیش عالمگیر قرار دے سکتے ہیں ان میں روٹی، پانی، صحت، بس، رہائش، جنس اور ولدیت اہم ترین ہیں۔ (ویسے ہم یہ سکتے ہیں کہ گرم علاقوں میں رہائش اور بس مطلق ضروریات نہیں ہیں پھر بھی منطقہ حارہ کے علاقوں کو چھوڑ کر ہم ان کو فہرست میں شامل کر سکتے ہیں) اب معاملہ یہ ہے کہ آزادی میں جو کچھ بھی شامل ہو، لیکن اس فہرست میں شامل کی جانے والی کسی شے سے محروم ہو کر کوئی شخص آزاد نہیں ہو سکتا۔ یہ اشیا تو آزادی کا کم از کم تقاضا ہیں۔

آئیے اب ہم ”معاشرے“ کی تعریف پر توجہ دیں۔ یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ یہاں ہم نے کم آزادی کی جو بات کی ہے وہ جنگوں میں زندگی بس کرنے والے را بن سن کر وہ سو کے مقابلے میں معاشرے میں رہنے والے کسی فرد کو بہتر طور پر حاصل ہو سکتی ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ جنس اور ولدیت بنیادی طور پر سماجی نویعت کی حامل ہیں۔ ”معاشرے“ کی تعریف ہم یوں کر سکتے ہیں کہ اس سے تعاون کرتے ہیں۔ جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے، خاندان سب سے ابتدائی سماجی گروہ ہے۔ معاشری سماجی گروہوں نے بہت بعد میں جنم لیا تھا۔ جنگ میں تعاون کرنے والے گروہ بظاہر اس قدر ابتدائی نہیں ہیں۔ دنیا نے جدید میں معاشرت اور جنگ سماجی پیوٹنگی کے اہم محکمات ہیں۔ خاندان یا قبیلہ کی سطح سے آگے بڑھ کر معاشرے نے جو ترقی کی ہے، اس کی طفیل ہماری آزادی میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ مظہم معاشرے میں ہم زیادہ محفوظ ہوتے ہیں اور دشمنوں کے ہاتھوں مرے جانے کا امکان کم ہوتا ہے۔ تا ہم یہ دعویٰ مشتبہ ہی ہے۔

اگر ہم نسیاٹی حرکیات کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی شخص کی خواہشات کو بنیادی

حیثیت دیں تو پھر اس کی آزادی کی راہ میں رکاوٹیں دو قسم کی ہیں۔ یعنی طبعی اور سماجی۔ آئیے ہم سادہ سی مثال سے اس بات کی وضاحت کریں۔ ممکن ہے کہ دھرتی سے اتنی خوراک نہ پیدا ہوتی ہو کہ وہ کسی شخص کی ضرورت پوری کر سکے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرے لوگ اسے خوراک حاصل نہ کرنے دیں۔ گویا ایک طرف معاشرہ فرد کی آزادی کی راہ میں حائل طبعی رکاوٹوں کو کم کرتا ہے تو دوسری طرف وہ سماجی رکاوٹیں پیدا بھی کرتا ہے۔ تاہم یہاں ہم خواہش پر معاشرے کے اثر کو نظر انداز کرنے سے غلطی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ چیونٹیاں اور شہد کی کھیاں بہت ہی متنقلم گروہوں کی صورت میں رہتی ہیں، اس لیے وہ ہمیشہ ساختہ طور پر وہی عمل کرتی ہیں جو ان کے گروہی فرائض کا تقاضا ہے۔ یہ بات اعلیٰ ترقیم کے غول پسند جانوروں کے معاملے میں بھی درست ہے۔ ممکن ہے کہ دو وحشت کے انسانوں کی صورت حال اس سے مختلف نہ ہو۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مہنذب انسان اگرچہ زیادہ ترقی یافتہ معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں، لیکن انپی جبتوں کے لحاظ سے وہ کم سماج پرست دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آزادی کے مسئلہ کو موضوع بحث بناتے ہیں۔

میں اس حقیقت سے انکار کا ہرگز ارادہ نہیں رکھتا کہ سب سے زیادہ مہنذب معاشروں میں بھی سماجی تعاون کی ایک جملی اساس ہوا کرتی ہے۔ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے ہم سائیوں جیسے ہوں اور وہ انہیں پسند بھی کریں۔ وہ ان کی راہ پر چلتے ہیں۔ پھر بھی لوگ جب زیادہ مہنذب ہو جاتے ہیں تو لگتا ہے کہ یہ عوامل دھن دے پڑ جاتے ہیں۔ بالغوں کے مقابلے میں یہ عوامل سکول جانے والے بچوں میں زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ دیسے بھی مجموعی طور ہم دیکھتے ہیں کہ کم ذہین افراد میں یہ عوامل کچھ زیادہ ہی مضبوط ہوتے ہیں۔ سماجی تعاون کی بنیاد اب گروہی جماعت کے بجائے اس تعاون کے فوائد کا عقلی فہم بنتا جا رہا ہے۔ غیر مہنذب انسانوں میں انفرادی آزادی کا مسئلہ سر نہیں اٹھاتا تھا، کیونکہ انہیں اس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی لیکن مہنذب انسان جوں جوں زیادہ تہذیب یافتہ ہوتے جا رہے ہیں، اس مسئلے کی شدت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ جوں جوں یہ امر واضح ہو رہا ہے کہ حکومت آزادی کی راہ میں حائل طبعی رکاوٹوں کو دور کر کے ہمیں آزاد ہونے میں مددے سکتی ہے، توں توں افراد کی زندگی کی تنظیم کا ری

میں حکومت کا کردار بڑھتا جا رہا ہے۔ صاف طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ تہذیب کا قابلہ آگے بڑھتا رہا تو پھر معاشرے میں آزادی کا مسئلہ بھی شدید تر ہوتا جائے گا۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ حکومت کے اختیارات میں کسی سے آزادی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی خواہیں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی ہیں۔ لہذا انارکی کا مطلب طاقتوروں کے لیے آزادی اور کمزوروں کے لیے غلامی ہو گا۔ حکومت کے بغیر عالمی آبادی موجودہ تعداد کا بکشکل دسوال حصہ رہ جائے گی۔ قحط اور بچوں کی اموات آبادی کو ہڑپ کر جائیں گی۔ عام زمانوں میں مہندب معاشروں میں جو سماجی غلامی پائی جاتی ہے، اس سے بدتر جسمانی غلامی کا رواج ہو جائے گا لہذا ہمارے پیش نظر مسئلہ یہ نہیں کہ حکومت کے بغیر کام کیسے چلایا جائے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ آزادی میں حکومت کی مداخلت کو کم سے کم روارکھتے ہوئے حکومت کی موجودگی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ کیونکر حاصل کئے جاسکتے ہیں اس کا مطلب جسمانی اور سماجی آزادی میں توازن پیدا کرنا ہے۔ سادہ لفظوں میں یوں کہئے کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ زیادہ خوراک اور بہتر صحت کے حصول کے لیے ہمیں حکومتی دباؤ کو مزید کس حد تک برداشت کرنا چاہیے؟

اس حوالے سے سادہ سامعاملہ یہ ہے کہ آیا خوراک اور صحت ہمارے لیے ہے یا کسی اور کے لیے؟ دیکھا گیا ہے کہ لوگ جب محاصرے میں آتے ہوں، یا جیسا کہ ۱۹۱۴ء سے انگلینڈ کی صورت حال تھی، تو پھر وہ ہر حد تک حکومتی دباؤ قبول کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں، کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دباؤ سب کے فائدہ کے لیے ہے۔ لیکن جب صورتحال یہ ہو کہ ایک شخص حکومت کے ستم برداشت کرے اور دوسرا خوراک حاصل کرے تو پھر معاملہ بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ یوں ہم سرمایہ داریت اور اشتراکیت کے مسئلے پر جا پہنچتے ہیں۔ سرمایہ داری کی حمایت کرنے والے آزادی کے مقدس اصولوں کا بہت چرچا کرتے ہیں۔ ان اصولوں کو ہم اس ایک کلیے میں پیش کر سکتے ہیں کہ 'جو خوش قسمت ہیں انہیں بدقسمتوں کے استھان سے نہ روکا جائے۔'

عدم مداخلت کا پرچار کرنے والے لبرلزم اس کلیے پرمنی ہے تاہم اسے انارکیت نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ بدقسمتوں کو قتل و غارت اور بغاوت و سرکشی سے روکنے کے لیے قانون کا سہارا لیتا ہے۔ جب تک ممکن تھا، اس نے ٹریڈ یونین ازم کی مخالفت بھی کی تھی۔

البته اس قدر حکومتی مداخلت کے بعد وہ اپنے باقی مقاصد معاشری قوت کے ذریعے حاصل کرنے کے درپے تھا۔ لبرلزم سرمایہ دار کو یہ حق دیتا تھا کہ وہ مزدور سے کہہ کہ ”تم بھوک سے مرجاً گے۔“ لیکن وہ مزدور کو یہ حق نہ دیتا تھا کہ وہ سرمایہ دار سے یہ کہہ کہ ”مجھ سے پہلے تم گولی سے اڑائے جاؤ گے۔“ قانونی موہنگا فیال اپنی جگہ، لیکن ان دونوں دھمکیوں میں فرق کرنا محض حماقت ہے۔ دونوں یکساں طور پر آزادی کے لیے خطرہ بنتی ہیں۔ تاہم لبرلزم نے جس عدم مساوات کو فروغ دیا وہ صرف معاشری شعبے تک محدود نہیں۔ بلکہ اس نظام نے عورتوں پر شوہروں کی اور بچوں پر باپوں کی آمریت کا جواز پیش کرنے کے لیے بھی آزادی کے مقدس اصولوں کو استعمال کیا۔ تاہم ہمیں قرار کرنا چاہیے کہ لبرلزم عورتوں پر شوہروں کی آمریت کو کم کرنے کا رجحان رکھتا تھا۔ بچوں کو کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کرنے کا جہاں تک تعلق ہے، بچوں پر باپ کی آمریت لبرلزم کے حامیوں کے باوجود کم ہوتی چلی گئی۔

خیر، اس موضوع پر پہلے ہی، بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ میں اس سے چھٹے رہنے کی خواہش نہیں رکھتا۔ لہذا میں ایک زیادہ عمومی مسئلے کی طرف رخ کرتا ہوں۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ معاشرے کو دوسرے فرد کی بجائے خود معاشرے کی خاطر کسی فرد کی زندگی میں کس حد تک مداخلت کرنی چاہیے؟ نیز یہ کہ کن مقاصد کی خاطر معاشرے کو مداخلت کرنی چاہیے؟ میرے خیال میں آزادی کے کم از کم لوازمات یعنی خوراک، پانی، صحت، رہائش، لباس، جنس اور ولادیت کو دوسرے امور پر ترجیح حاصل ہونی چاہیے۔ یہ چیزیں زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہیں۔ لہذا ہم انہیں ضروریات قرار دے سکتے ہیں۔ ان کے بعد آنے والی اشیا کا شمار ہم حالات کے حوالے سے، سامان آسائش یا اشیائے عیش و عشرت میں کر سکتے ہیں۔ میں اسے ایک مقدم شرط کے طور پر تسلیم کر لوں گا کہ کسی اور ایک فرد کو ضروریات زندگی فراہم کرنے کی غرض سے کسی دوسرے شخص کو سامان آسائش سے محروم کرنا جائز ہے۔ ممکن ہے کہ کسی معاشرے میں کسی خاص زمانے میں یہ بات سیاسی یا معاشری طور پر مفید نہ ہو۔ تاہم آزادی کے حوالے سے اس بات کو قابل اعتراض نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ وجہ یہ ہے کہ کسی شخص کو ضروریات زندگی سے محروم رکھنا آزادی کے اصول کو زیادہ شدید خلاف ورزی ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی شخص کو سامان عیش و عشرت سمنے سے

روکنامہ اہم ہے۔

اس نقطہ نظر کو قبول کر لیا جائے تو بات دور تک پہنچتی ہے۔ بلد تیاتی امتحابات میں ایک حل طلب مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ عوامی صحت، ماں بچے کی دیکھ بھال اور بچوں کی بہبود جیسے امور کے لیے کس قدر سائل مخصوص کئے جائیں۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ان امور پر خرچ ہونے والی رقم سے زندگی بچانے میں بہت مدد ملتی ہے۔ لندن شہر کے تمام حلقوں میں امیر لوگ اس رقم میں اضافے کو روکنے اور ممکن ہو تو کم کرنے کے لیے آپس میں مل جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امیر لوگ ہزاروں افراد کو لقمہ اجل بنانے پر آماڈہ ہوتے ہیں تاکہ ان کی عیش و عشرت میں کوئی فرق نہ آئے۔ اب چونکہ اخبارات پر بھی ان کو اثر و رسوخ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ستم رسیدہ انسانوں سے حقائق کو چھپانے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ تخلیل نفسی کے ماہرین کے جانے پہنچانے طریقوں سے وہ ان حقائق کو اپنے آپ سے بھی چھپا لیتے ہیں۔ ویسے بھی اس میں کوئی نرالی بات نہیں۔ دنیا میں ہر جگہ اور ہر زمانے میں امر کا یہی وظیفہ رہا ہے۔ یہاں میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آزادی کی بنیاد پر ان کے طرز عمل کا دفاع نہیں کیا جاسکتا۔

جنس اور ولدیت کے حق پر میں بحث نہیں کرنا چاہا۔ تا ہم اس قدر ضرور کہوں گا کہ مسیحی رہبانیت کی روایت کا ایک ناخوشگوار نتیجہ یہ سامنے آیا کہ لوگ روٹی کے حق کو تو تسلیم کرتے ہیں، لیکن جنس کے حق کو نظر انداز کر دیئے ہیں۔ سیاست دانوں کے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ وہ انسانی فطرت کو جان سکیں۔ عام مردوں اور عورتوں کو متحرک کرنے والی خواہشوں کا انہیں کچھ علم ہی نہیں ہے۔ اگر کسی سیاست جماعت کے قائدین نفیات کی تھوڑی بہت سوچ بوجھ رکھتے ہوں تو وہ جماعت غیر معمولی کامیابیاں حاصل کر سکتی ہے۔

اچھا میں تو مانتا ہوں کہ لوگوں کو ضروریات زندگی مہیا کرنے کی غرض سے معاشرے کو دخل دینے کا حق حاصل ہے۔ لیکن یہ بات تسلیم نہیں کرتا کہ ان امور میں بھی معاشرے کی دخل اندازی جائز ہے جن میں فردانی کامیابیاں دوسروں کی قیمت پر حاصل نہیں کرتا۔ یہاں میں نقطہ نظر، علم اور آرٹ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ کسی معاشرے کی اکثریت اگر کسی رائے کو کسی نقطہ نظر کو پسند نہیں کرتی تو بھی اسے اس رائے کے حامل افراد کو راہ راست پر لانے کا کوئی حق نہیں۔ اسی طرح اگر کسی معاشرے کی اکثریت بعض

حقائق کو جاننے کی روادر نہیں تو اسے یہ حق حاصل نہیں ہو جاتا کہ ان حقائق کو جاننے کے آرزومند افراد کی جیل کو کمال کو ٹھری میں ڈال دیا جائے۔

میں ایک خاتون کو جانتا ہوں جس نے نیکسas کی خاندانی زندگی کے موضوع پر ایک مفصل کتاب لکھی ہے۔ میرے خیال میں علم سماجیات کے حوالے سے یہ ایک قابل قدر کتاب ہے۔ اب چونکہ پولیس کے خیال میں حقائق کی اشاعت بہت بڑی بات ہے، لہذا اس نے ڈاک کے ذریعے اس کتاب کی ترسیل کو غیر قانونی قرار دے رکھا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ تخلیل نفسی کے مریضوں کا علاج اکثر اوقات محض اس طریقے سے کیا جاتا ہے کہ انہیں لا شعور میں ٹھنکے ہوئے حقائق دوبارہ شعور میں لانے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ بعض حوالوں سے معاشرہ بھی ان مریضوں جیسا ہوتا ہے۔ لیکن اپنے علاج کا موقع دینے کے مجاہے معاشرہ اس ڈاکٹر کو سزا دیتا ہے جو ناپسندیدہ حقائق کو اس کے سامنے پیش کرتا ہے۔ آزادی میں مداخلت کی یہ نہایت ہی ناپسندیدہ صورت ہے۔ ذاتی اخلاقی ضابطوں میں مداخلت کے بارے میں بھی یہی بات درست ہے۔ اگر کوئی مرد و بیویاں رکھنا چاہتا ہے یا کوئی عورت دو شوہر رکھنے کی خواہش مند ہے تو یہ ان لوگوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ دوسروں کو اس میں دخل دینے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی چاہیے۔

یہاں تک میں نے آزادی میں جائز مداخلتوں کی حدود کے بارے میں محض تجربی استدلال پیش کیا ہے۔ اب میں زیادہ نفسیاتی امور کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ ہم بات کرچکے ہیں، آزادی کی راہ میں سماجی اور طبی دو قسم کی رکاوٹیں حائل ہیں۔ آزادی کو یکساں نقصان پہنچانے والی کسی طبی اور سماجی رکاوٹ میں سے سماجی رکاوٹ زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ غصہ اور آزر دگی پیدا کرتی ہے۔ اگر کوئی لڑکا درخت پر چڑھنا چاہتا ہے اور آپ اسے روک دیتے ہیں تو اسے شدید غصہ آتا ہے۔ اس کے بجائے اگر وہ خود ہی درخت پر نہیں چڑھ سکتا تو اس طبی رکاوٹ کو چپ چاپ مان لیتا ہے۔ غصے سے بچنے کی خاطر اکثر اوقات یہ بات مناسب ہو سکتی ہے کہ ان امور کی اجازت دے دی جائے جو بذات خود نقصان دہ ہیں۔ مثلاً دبکے دنوں میں بھی لوگ عبادت کے لیے جانا چاہتے ہیں تو انہیں عبادت گاہ جانے دیجیے۔ حکومتوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ عوام کی ناراضگی سے بچنے کی خاطر بدمستیوں اور ناکامیوں کی ذمہ داری فطری اسباب پر تھوپ

دیتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں مخالف سیاسی جماعتیں ان کا تعلق انسانی اسباب سے جوڑتی ہیں۔ مثلاً جب روٹی کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے تو حکومت خنک سالی اور بری فصل کو اس کا ذمہ دار قرار دیتی ہے۔ مخالف سیاسی جماعتیں دعویٰ کرتی ہیں کہ روٹی کی قیمت میں اضافہ حکومت کی غلط پالیسیوں اور منافع اندوزوں کے سبب ہوا ہے۔

ترقی اور صنعت کاری کے زیر اثر عوام یہ یقین کرنے لگے ہیں کہ انسان کے امکانات اور صلاحیتیں بے پناہ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کوئی ایسی قدر ترقی آفت نہیں جس پر انسان قابو نہ پاسکے۔ سو شلزم اسی عقیدے کی ایک صورت ہے کیونکہ اس کا کہنا یہ ہے کہ غربی خانے نازل نہیں کی بلکہ وہ انسانی حماقت اور ظلم کا نتیجہ ہے۔ اس نقطے نظر نے فطری طور پر سرمایہ داروں کے بارے میں محنت کشوں کا رو یہ تبدیل کر دیا ہے۔

بس اوقات انسان کے قادر مطلق ہونے کے عقیدے میں بہت ہی شدت پیدا کر دی جاتی یہ۔ چنانچہ بعض اشتر اکی بظاہر یہ سمجھتے ہیں کہ اگر آبادی اس قدر بڑھ جائے کہ کرہ ارض پر انسانوں کے لیے صرف کھڑا رہنے کی گنجائش رہ جائے تو بھی سب کے لیے کافی مقدار میں خوراک موجود ہے گی۔ میرے نزدیک یہ احتمانہ مبالغہ آرائی ہے۔ بہر حال انسان کی قدرت کاملہ پر جدید ایمان کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جب کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے تو غصہ بڑھ جاتا ہے، کیونکہ اب تمام بدمیتیوں اور آفتوں کے لیے انسان کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے اور اس وقت بھی ان کا تعلق خدا سے یا فطرت سے نہیں جوڑا جاتا جب کہ ایسا کرنا جائز ہو سکتا ہے۔ یوں ماضی کے مقابلے میں اب انسانوں پر حکومت کرنا زیادہ دشوار ہو گیا ہے۔ دوسری طرف اسی سبب سے حکمران طبقوں کی مذہب میں دلچسپی بڑھ گئی ہے اور وہ مذہب سے اپنے لگاؤ کی نمائش کرتے رہتے ہیں، کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی رعایا بدمیتیوں، مصیتیوں اور دیگر مسئللوں کے لیے انہیں موردا الزام ٹھہرانے کے بجائے انہیں خدا کی مرضی تسلیم کر لیں۔ اس صورت حال میں بنیادی آزادیوں میں مداخلت کو جائز ثابت کرنا پہلے کے مقابلے میں بہت دشوار ہو گیا ہے۔ اب انہیں ناقابل تسلیخ قوانین قرار دینا ممکن نہیں رہا، حالانکہ علمائے مذہب اس پر اے طریقہ کار کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ سماجی آزادی میں رکاوٹیں پیدا کرنے سے صرف غصہ ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ دو اور ایسے اسbab بھی ہیں جو ان رکاوٹوں کو ناپسندیدہ بناتے ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ لوگ

دوسروں کی خوش حالی اور بہبود کو پسند نہیں کرتے۔ دوسرا سب یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم نہیں کہ دوسروں کی خوشی و بہبود کس بات پر مخصوص ہے۔ شاید بنیادی طور پر یہ دونوں اسے اس سب ایک ہی ہیں۔ کیونکہ جب ہم خلوص دل سے کسی دوسرے شخص کی بھلائی چاہتے ہیں تو عموماً ہم یہ جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ اس کی ضروریات کیا ہیں۔ بہر حال لوگ خواہ بد خواہی سے یا جہالت سے دوسروں کو نقصان پہنچائیں تو عملی نتائج میں فرق نہیں پڑتا۔ وہ ایک جیسے ہی رہتے ہیں۔ لہذا ان دونوں اسے اس سب کو ایک ہی سمجھ سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں کے مفادات کی حفاظت کے لیے کسی شخص یا طبقے پر اعتماد مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے۔

جمهوریت کے حق میں پیش کئے جانے والے استدلال کی بنیاد یہی ہے۔ تاہم جدید ریاست میں جمهوریت افردوں کے دیلے سے کام کرتی ہے، لہذا جہاں تک فردا کا تعلق ہے وہ بالواسطہ اور دور از کار رہ جاتی ہے۔ افسر شاہی میں ایک خاص خطرہ پوشیدہ ہے، وہ یہ کہ عام طور پر افسر اپنے دفتروں میں بیٹھتے ہیں اور یہ دفاتر ان لوگوں سے بہت دور ہوتے ہیں جن پر وہ حکومت کرتے ہیں۔ تعلیم کی مثال ہی لے لیجئے۔ استاد بچوں کو تعلیم دیتے ہیں، اس لیے وہ بچوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ان کی پرداہ بھی کرتے ہیں، لیکن اساتذہ کو کنٹرول ایسے افسر کرتے ہیں جن کو کوئی عملی تجربہ نہیں ہوتا اور جن کے لیے بچوں کی حیثیت مخف فضوں لوئندوں کی سی ہو سکتی ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ جب حکام اساتذہ کی آزادی میں دخل دیتے ہیں تو عموماً یہ بات نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ دوسرے شعبوں کا حال بھی یہی ہے۔ قوت ان لوگوں کے پاس ہوتی یہ جو مالی و سائل پر حاوی ہوتے ہیں۔ قوت ان لوگوں کے پاس نہیں جوان امور کا علم رکھتے ہیں جن پر یہ وسائل خرچ کے جاتے ہیں۔ یوں ابھی قوت عموماً بے خبر اور بد خواہ ہوا کرتے ہیں وہ اپنے اختیارات جس قدر کم استعمال کریں، اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔

محبوری کا معاملہ وہاں شدید ترین ہوتا ہے جہاں مجبور کیا جانے والا شخص مجبوری کو اخلاقی رنگ دے دیتا ہے، حالانکہ اگر اس کے لیے ممکن ہوا تو وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتا جس کو وہ اپنا فرض قرار دیتا ہے۔ ہم سب محسول ادا کرتے ہیں چاہے ہمیں سڑکیں نہ مہیا کی جائیں۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی ایسا مجرم ہو جائے کہ محسول جمع کرنے والے کو ہم نظر ہی نہ آئیں تو ہم بھی اسے اپنے وجود سے آگاہ نہ کریں گے۔ اسی طرح کوکین کی

مانعنت کو ہم سب قبول کر لیتے ہیں، جب کہ شراب پر پابندی کا معاملہ متفکوک رہتا ہے۔
بہر حال بہترین مثال بچوں کی ہے۔ بچوں کو اتحاری کی نگران میں رکھنا لازم
ہے۔ بچے خود بھی اس بات سے آگاہ ہیں، اگرچہ کبھی کبھار وہ بغاوت کا کھیل رچانا پسند
کرتے ہیں۔ بچوں کا معاملہ اس لحاظ سے عجیب و غریب ہے کہ جن بچوں پر اتحاری موجود
ہوتی ہے، وہ بسا اوقات اسے پسند کرنے لگتے ہیں۔ جہاں کہیں یہ صورت حال ہو، وہاں بچے
عام طور پر اتحاری کے خلاف رنجیدگی کا اظہار نہیں کرتے، البتہ خاص خاص موقعوں پر اس
کی مزاحمت ضرور کرتے ہیں۔

اس اتنے کے برخلاف تعلیمی حکام الیکی خوبی سے محروم ہیں۔ یہ حکام ملک و قوم کی
بہتری کی خاطر بچوں کو حب الوطنی کا درس لینے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ حب الوطنی اس کے
سو اور پچھنہیں کہ معمولی باتوں کی خاطر قتل کرنے یا قتل ہونے کی خواہش پیدا کی جائے۔
اتھاری اگر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو اپنے ماتھوں کے خیرخواہ ہیں تو پھر اتحاری نبتاب
بے ضرور ہوا کرتی ہے۔ تاہم یہ نتیجہ حاصل کرنے کا کوئی بھی معلوم طریقہ کارنہیں ہے۔
جرس وقت بدترین ہوا ہے جب اس کا نشانہ بننے والے کو یقین ہو کہ جس کام کا
اسے حکم دیا جا رہا ہے وہ غلط یا نقصان دہ ہے کہی مسلمان کو سور کا گوشت یا کسی ہندو کو گائے کا
گوشت کھانے پر مجبور کرنا نفرت انگیز اور مکروہ ہے۔ جو لوگ چیپک کا یہکہ لگانے کے مخالف
ہیں، انہیں یہ یہکہ نہیں لگانا چاہیے۔ البتہ ان کے چھوٹے بچوں کا معاملہ مختلف ہے۔ بچوں کی
زندگی بچانے کے لیے انہیں یہکہ لگانا ہی چاہیے۔

آزادی کے اس معاملے میں اہم ترین فرق دو قسم کی نیکیوں میں ہے۔ ایک
طرف وہ نیکیاں ہیں جن کو کوئی شخص دوسروں کی قیمت پر قبول کئے رکھتا ہے۔ دوسرا طرف
الیکیاں ہیں جن میں ایک شخص کا فائدہ دوسرا نقصان نہیں ہے۔ اگر میں اپنے جائز حصے
سے زیادہ خوراک چٹ کر جاتا ہوں تو کوئی دوسرا شخص بھوکا رہ جاتا ہے لیکن اگر میں ریاضی
کا بہت زیادہ مطالعہ کرتا ہوں تو اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچتا بشرطیہ میں تعلیمی موقع پر
اپنی اجرہ داری قائم نہ کروں۔ ایک اور نکتہ بھی یہاں غور طلب ہے۔ روٹی، کپڑا امکان
زندگی کی ضروریات میں اور اس بارے میں لوگوں میں زیادہ اختلاف نہیں ہے لہذا
جہوری نظام میں حکومت کو ان کے معاملے میں دخل اندازی کا حق ہونا چاہیے۔ ایسے

سارے معاملات میں انصاف کو بالادستی حاصل ہونی چاہیے۔ جدید جمہوری معاشرے میں انصاف کا مطلب مساوات ہے۔ تاہم ایسے معاشرے میں اس کا مطلب مساوات نہ ہوگا جس میں طبقوں کی درجہ بندی ہو اور نچلے اور بالائی دونوں طبقوں والے اسے قبول نہ ہوں۔ جدید انگلستان میں بھی اگر یہ تجویز پیش کی جائے کہ پادشاہ کی شان و شوکت ایک عام مزدور سے زیادہ نہ ہونی چاہیے تو بہت سے مزدوروں کو بھی اس سے رنج پہنچے گا۔ لہذا میں چاہتا ہوں کہ انصاف کی تعریف یوں کی جائے کہ اس سے مراد کم سے کم حد پیدا کرنے والا نظام ہے۔ ضعیف الاعتقادی سے پاک معاشرے میں اس کا مطلب برابری ہوگا۔ تاہم سماجی نابرابری میں ایمان رکھنے والے معاشرے میں معاملہ المثل ہوگا۔

خیز، جہاں تک رائے، فکر، آرٹ وغیرہ کا تعلق ہے ان میں ایک شخص اپنی کامیابیاں دوسروں کی قیمت پر حاصل نہیں کرتا۔ مزید برآں شعبے میں اچھائی کا تعین بھی مشکوک ہے۔ اگر الف عیش اڑاہ رہے اور رب روکھی سوکھی روٹی سے پیٹ کی آگ بجھا رہا ہے، تو الف کی طرف افلام کے فائدے پر وعظ ریا کاری ہوگی۔ لیکن اگر مجھے ریاضی پسند ہے اور آپ موسیقی کے ریساہیں تو ہم ایک دوسرے کے معاملے میں دخل نہیں دیتے اور جب ہم ایک دوسرے کے ذوق کی داد دیتے ہیں تو شاشٹگی کا اظہار کرتے ہیں۔ جہاں تک رائے کا معاملہ ہے، صداقت تک پہنچنے کا واحد راستہ مقابلہ ہے۔ لبرل ازم کے پرانے حامیوں سے غلطی ہوئی ہے۔ وہ کاروبار میں آزاد مقابلے کا پرچار کرتے رہے ہیں، جب کہ انہیں خیالات کی دنیا میں آزاد مقابلے کی حمایت کرنی چاہیے تھی۔ ہم بھی کاروبار کے مجھے خیالات کی دنیا میں آزاد مقابلہ چاہتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ کاروبار میں آزاد مسابقت ختم ہوتی ہے تو فتحیں اپنی معاشی قوت کو ذہنی اور اخلاقی شعبوں میں زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ وہ روزی کمانے کی اجازت کو راست زندگی اور راست سوچ سے مشرود کرنے پر زور دیتے ہیں۔ یہ بدقتی کی بات ہے، کیونکہ راست زندگی کا مطلب ریا کاری اور راست سوچ کا مطلب بے وقوفی ہے۔ سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ آیا امراء کی حکومت یا اشٹرا کی نظام میں معاشی ایڈارسی کے ذریعے تمام ذہنی اور اخلاقی ترقی مجال ہو جائے گی۔ فرد کی آزادی کا احترام وہاں ہونا چاہیے جہاں کے اعمال سے دوسروں کو کوئی براہ راست، واضح اور غیر مشکوک نقصان نہیں پہنچتا۔

بصورت دیگر ہماری ایذا رسان جب تھیں سولہویں صدی کے پہنچی ایک ہی دھڑے پر چلنے والا معاشرہ تعمیر کر دیں گی۔ یہ خطرہ حقیقی ہے اور ہم بھی۔ اگر ہم نے آزادی کو اس کے مناسب مقام پر رکھنا نہ سیکھا تو پھر اس خطرے سے دوچار ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔ ہمیں ایسی آزادی کی خواہش نہ کرنی چاہیے جو دوسروں کو دبانے والی ہو بلکہ ہمیں ایسی آزادی تلاش کرنی چاہیے جو ہمیں اپنی مرضی کے مطابق رہنے اور سوچنے کا حق دے اور ہمارے اس حق سے دوسروں کو نقصان نہ پہنچے۔

آخر میں میں اس شے کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں جس کو اس مضمون کے آغاز میں ”نسیاتی حرکیات“ کا نام دیا گیا تھا۔ جس معاشرے میں ایک ہی قسم کا کریمہ ملتا ہو، اس میں مختلف قسم کے کریمہ رکھنے والے معاشرے کے مقابلے میں زیادہ آزادی ممکن ہو سکتی ہے۔ انسانوں اور شیروں پر مشتمل معاشرے میں آزادی خطرے میں رہتی ہے، کیونکہ وہاں شیروں کو پابند سلاسل کرنا پڑتا ہے یا پھر انسانوں کو۔ اس طرح دنیا میں جس جگہ رنگ دار لوگوں پر سفید فام حکمران ہیں، وہاں آزادی ممکن نہیں۔ زیادہ سے زیادہ آزادی کو ممکن بنانے کے لیے تعلیم کے ذریعے کردار سازی ضروری ہے تاکہ انسان ایسی سرگرمیوں سے خوشی حاصل کرنا سیکھ سکیں جو دوسروں کو دبانے والی نہیں ہے۔ کردار سازی میں موثر کام زندگی کے پہلے چھ برسوں میں ہوتا ہے۔ ڈپٹ فورڈ میں مس میکملن بچوں کی اس طرح تربیت کر رہی ہیں کہ وہ آزاد معاشرے تخلیق کرنے کے قابل بن جاتے ہیں۔ اگر مس صاحبہ کے طریقوں کا اطلاق امیر غریب تمام بچوں پر کیا جائے تو محض ایک نسل ہمے تمام سماجی مسائل حل کرنے کے لیے کافی ہوگی۔ تاہم تربیت پر اصرار کے سب تمام فریق یہ بات بھول گئے ہیں کہ تعلیم میں اہم شے کیا ہوتی ہے۔ بچپن گزرنے کے بعد خواہشوں کو کثروں تو کیا جا سکتا ہے لیکن انہیں بدلا نہیں جا سکتا۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ انسانوں کو بچپن ہی میں زندہ رہا اور زندہ رہنے دو، کا سبق سکھایا جائے۔ انسان اگر ایسی چیزوں کی خواہش نہ کرنے لگیں جن کو صرف دوسروں کی بدقتی کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے تو پسماجی آزادی کی راہ میں حائل رکاوٹیں بھی ختم ہو جائیں گی۔

خوش باش شخص

مسرت کا دار و مدار کسی حد تک بیرونی حالات پر ہوتا ہے اور کسی حد تک خود فرد پر۔ جہاں تک فرد کے حصے کا تعلق ہے، مسرت کا حصول مشکل نہیں، بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ مذہب سے ملتے جلتے کسی عقیدے کے بغیر مسرت حاصل نہیں کی جاسکتی۔ رنجیدہ رہنے والے بہت لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے رنج والم کے اسباب پچیدہ اور ذہنی قسم کے ہیں۔ لیکن میں ان سے متفق نہیں۔ میرا نہیں خیال کر اس قسم کے امور مسرت یا رنج کے حقیقی اسباب ہیں۔ میرے نزدیک تو وہ صرف علامتیں ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ رنجیدہ رہنے والا شخص عوام کی المناک عقیدے کو قبول کر لیتا ہے اور خوش باش رہنے والا مسرت افزا عقیدہ اپنالیتا ہے۔ پھر دونوں مسرت و رنج کو اپنے اپنے عقیدوں سے وابستہ کرنے لگتے ہیں، جب کہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

اکثر لوگوں کی مسرت کے لیے بعض اشیا ضروری ہیں مگر وہ بہت سادہ قسم کی اشیا ہیں۔ اس فہرست میں روٹی، مکان، صحت، محبت، کامیاب کام اور اپنے گروہ کا احترام شامل ہیں۔ بعض لوگوں کے لیے بال پچوں کا ہونا بھی لازمی ہے۔ ان چیزوں کی غیر موجودگی میں کوئی خاص قسم کا شخص ہی خوش باش رہ سکتا ہے۔ لیکن جب خوشی کے یہ لوازمات موجود ہوں یا انہیں مناسب کوشش سے حاصل کیا جاسکتا ہو اور اس کے باوجود کوئی شخص رنج والم کا شکار ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی نفیا تی عدم مطابقت کا مریض ہے۔ عام صورت میں اس قسم کا مریض اپنا علاج خود کر سکتا ہے۔ ہاں، اگر مرض میں شدت ہو تو کسی نفیا تی معالج کی خدمت حاصل کرنی ہو گی۔

خارجی حالات اگر زیادہ ناخوش گوارن ہوں تو پھر آدمی کو خوشی حاصل کرنے کے قابل ہونا چاہیے۔ شرط یہ ہے کہ اس کے جذبوں اور دلچسپیوں کا رنج باطن کے بجائے خارج کی طرف ہو۔ لہذا تعلیم کے معاملے میں اور دنیا کے ساتھ ہم آہنگی کی کوششوں میں ہمارا مطیع نظر یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنی ذات کو مرکز بنانے والے جذبوں سے

گریز کریں اور ان دلچسپیوں کی طرف راغب ہوں جو ہمارے خیالات کو ہمیشہ مغض ہماری ذات کے گرد گھومنے سے بچائیں۔ اکثر لوگوں کی فطرت نہیں کہ وہ بندی خانے میں خوش باش رہ سکیں۔ اپنی ذات تک ہمیں محدود کرنے والے جذبے بدترین بندی خانے بناتے ہیں۔ اس قسم کے جذبے میں خوف، حسد، احساس گناہ اور اپنی تعریف کرنے کے جذبے زیادہ عام ہیں۔ ان سب میں ہماری توجہ اپنی ذات تک محدود رہتی ہے۔ پیروں دنیا میں کوئی حقیقی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ بس یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ پیروں دنیا کہیں ہمیں نقصان نہ پہنچائے یا ہماری خودی کو ٹھیک نہ لگائے۔

یہ زیادہ تر خوف کے سبب ہوتا ہے کہ لوگ حقائق سے نظریں چڑاتے ہیں اور اپنے گرد پر دے تاں لینے پر آمادہ رہتے ہیں لیکن حقیقوں کے کائنے ان پر دوں کا دامن چاک کر دیتے ہیں۔ یوں پناہ کی میلاد میں ان کے پیچھے چھپے ہوئے شخص کو اس فرد کے مقابلے میں کہیں زیادہ تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو ابتداء ہی سے جرأت مندی کے ساتھ حقائق کو تسلیم کرنے کی راہ اپناتا ہے۔ بات یہ بھی ہے کہ اپنے آپ کو فریب دینے والے عموماً دل کی گہرائیوں میں اپنے کرتوت سے آگاہ ہوتے ہیں الہا ہر وقت انہیں خدشہ رہتا ہے کہ کوئی ناگوار واقعہ انہیں ناپسند حقائق کو تسلیم کرنے پر مجبور نہ کر دے۔

اپنی ذات کو مرکز بنانے والے زندگی میں تنوع پیدا نہیں ہونے دیتے، مانا کہ صرف اپنے آپ سے محبت کرنے والے کو ہر جائی ہونے کا طعنہ نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن آخر کار اسے ایک ہی شے سے یعنی اپنی ذات سے چھٹے رہنے سے پیدا ہونے والی ناقابل برداشت بوریت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ احساس گناہ کا شکار فرد بھی اصل میں ایک خاص قسم کی خود پرستی کا مریض ہوتا ہے۔ اس عظیم الشان کائنات میں اسے اہم ترین باتیں معلوم ہوتی ہے کہ بس وہ خود پارسا ہو۔ روایتی مذہب کی بعض صورتوں کی ایک اہم برائی یہ ہے کہ انہوں نے اس قسم کی خود پرستی کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

خوش باش شخص وہ ہوتا ہے جس کی چاہتوں اور دلچسپیوں میں تنوع ہوتا ہے۔ ان کے ذریعے وہ اپنی خوشیاں سمیٹتا ہے۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے ذریعے وہ بہت سے دوسرے لوگوں کی چاہت اور دلچسپی کا مرکز بن جاتا ہے۔ دوسروں کی چاہت اور دلچسپی کا معروض بننا حصول مسرت کا ایک زبردست منجع ہے لیکن دوسروں سے چاہت کا مطالبه کرنے والا اس سے محروم رہتا ہے۔ عام طور پر چاہت اسے ملتی ہے جو دوسروں کو چاہت

دینے والا ہوتا ہے۔ ہاں، یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ لین دین کا روبروی طرز کا نہیں۔ اچھا تو پھر اس شخص کو کیا کرنا چاہیے جو اپنی ذات کے خول میں بند ہونے کے سبب خوشیوں سے محروم ہے؟ جب تک وہ اپنی رنجیدگیوں کے بارے میں سوچتا رہتا ہے، تب تک وہ اپنی ذات کے حصار میں محصور رہتا ہے۔ یوں وہ اس چکر سے باہر نہیں بکل سکتا۔ وہ صرف حقیقی دلچسپیوں کی مدد سے باہر قدم نکال سکتا ہے۔ دوا کے طور پر اختیار کی جانے والی جھوٹ موت کی دلچسپیاں اس کے کام نہیں آسکتیں۔ یہ مشکل حقیقی سہی، لیکن اگر اس نے اپنے مسئلے کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے تو پھر وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شعوری یا لاشعوری احساس گناہ اس کے مصائب کا سبب ہے تو پہلے وہ اپنے شعوری ذہن کو قائل کر سکتا ہے کہ اس احساس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ بعد ازاں وہ اس اعتراف کو اپنے لاشعوری ذہن میں بھاگ سکتا ہے۔ دریں اشنا وہ بعض کم و بیش بے تعلق قسم کی دلچسپیوں میں حصہ لے سکتا ہے۔ اگر وہ حساس گناہ سے نجات پانے میں کامیاب ہو جائے تو غالباً حقیقی معروضی دلچسپیاں خود بخود پیدا ہونے لگیں گی۔ خود ترسی کا شکار ہونے کی صورت میں وہ اس طریقے سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ اُسے اپنے آپ کو یہ یقین دلانا ہو گا کہ اس کے حالات میں کوئی غیر معمولی بد قسمی کارفرمانیں ہے۔

اسی طرح مسئلہ اگر خوف کا ہو تو اسے ایسی مشقیں کرنی چاہیں جو حوصلہ اور جرأت دینے والی ہوں۔ زمانہ قدیم ہی سے حالت جنگ میں جرأت کے مظاہرے کو اہم خوبی خیال کیا جاتا ہے اور نوجوانوں کی تربیت کا بڑا حصہ جنگ میں بے خوفی سے کام لینے والا کردار پیدا کرنے سے تعلق رکھتا ہے البتہ اخلاقی جرأت اور ذہنی جرأت کا مطالہ کم ہی کیا گیا ہے۔ بہر حال ان کو پیدا کرنے کے اپنے طریقے ہیں۔ اگر آپ ہر روز کم از کم ایک ناگوار سچائی کا اعتراف کرنے لگیں تو دیکھیں گے کہ یہ طریقہ کار اتنا ہی مفید ہے جتنا کسی بوائے سکاث کا ہمدردانہ فعل ہوا کرتا ہے۔ اپنے آپ کو سمجھائیے کہ اگر آپ اپنے تمام دوستوں سے میکی اور ذہانت کے لحاظ سے بے حد بہتر نہ ہوتے، جیسا کہ آپ ہیں، تو بھی زندگی زندہ رہنے کے قابل ہی ہوتی۔ برسوں تک اس قسم کی مشق کرنے سے آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ کسی تردد کے بغیر حقائق کا سامنا کر سکیں۔ یوں بہت سے خوفوں سے نجات مل جائے گی۔

جب آپ اپنے آپ میں مگن رہنے کے روگ پر قابو پالیں گے تو پھر معروضی دلچسپیوں کا معاملہ آپ اپنی فطرت اور حالات کے بے ساختہ عمل پر چھوڑ سکتے ہیں۔ خود سے

یہ نہ کہیے کہ اگر میں نکٹ جمع کرنے لگوں تو اس مشغلو سے مجھے خوشی حاصل ہو جائے گی۔ یہ نہ ہو کہ آپ خوشی کی امید پر نکٹ جمع کرنے میں بھت جاتے جائیں اور اس سے کوئی خوشی حاصل نہ ہو۔ صرف وہی بات آپ کے لیے مفید ہو سکتی ہے جس میں آپ کو حقیقی دلچسپی ہو۔ بہر حال آپ یہ یقین ضرور کر سکتے ہیں کہ جب آپ اپنی ذات کے حصار سے قدم باہر نکالیں گے تو حقیقی معروضی دلچسپیاں بھی نمایاں ہو جائیں گی۔

خوش باش زندگی ہی اصل میں غیر معمولی حد تک اچھی زندگی ہے۔ پیشہ و معلمین اخلاق نے کسر نفی کا بہت چرچا کیا ہے۔ اس طرح وہ غلط جگہ پر دباؤ ڈالتے رہے ہیں۔ ذات کی نفی کرنے کی کوشش شعوری طور پر کی جائے تو پھر فرداپنی ذات میں سمٹ جاتا ہے۔ ہر وقت اُس کے ذہن پر یہ خیال چھایا رہتا ہے کہ اُس نے کون کون سی قربانیاں دی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کوشش سے فوری مقصد حاصل کرنے میں اکثر ناکامی ہوتی ہے اور جہاں تک اُس کے تھتی مقاصد کا تعلق ہے، وہ کم و بیش ہمیشہ ہی حاصل نہیں ہوتے۔ ضرورت کسر نفی کی نہیں بلکہ اپنی ذات سے باہر دلچسپیوں کی سمت متعین کرنے کی ہے جو بے ساختہ اور فطری انداز میں ویسے ہی اقدامات کی طرف لے جاتی ہیں جیسے اقدامات اپنی خوبی کی جگہ میں ڈوبا ہو شخص شعوری کسر نفی کے ویلے سے کر سکتا ہے۔

بظاہر یہاں میرارویہ لذت پرست جیسا ہے، یعنی میں مسرت کو اچھائی کا درجہ دیتا ہوں۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ لذت پرست کے نقطہ نظر سے جن اقدامات کی سفارش کی جاتی ہے وہ عموماً وہی ہیں جن کی سفارش کوئی دانا اخلاق پرست کر سکتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ درست نہ سہی پھر بھی ہوتا یہ ہے کہ اخلاق پرست ذہن کی کیفیت کے بجائے عمل پر زیادہ زور دیتا ہے۔ کسی عمل کے اثرات عمل کرنے والے کے اُس لمحے کی وہنی کیفیت کے حوالے سے مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی بچے کو ڈوبتے دلکھ کر مدد کرنے کی خواہش کے تحت آپ اُسے بچالیں تو اُس عمل کی اخلاقی حیثیت کو کوئی ضعف نہ پہنچے گا۔ لیکن اگر آپ بچے کو ڈوبتا دلکھ کر خود سے یہ کہیں کہ ”کسی بے بس کی مدد کرنا نیکی ہے اور میں نیک بننا چاہتا ہوں۔ لہذا لازم ہے کہ اس بچے کی جان بچاؤں“ تو پھر آپ سے بدتر فرد ہوں گے۔ اس انتہائی معاملے میں جو بات درست ہے، وہ بہت سے دوسرے قدرے غیر واضح معاملات میں بھی درست ہے۔ زندگی سے متعلق میرے اور روایتی اخلاق پرستوں کے روایوں میں ایک اور

فرق بھی ہے، جو قدرے اطیف ہے۔ مثال کے طور پر روایتی اخلاق پرست یہ کہیں گے کہ محبت کو بے غرض ہونا چاہیے۔ ایک لحاظ سے وہ درست کہتے ہیں۔ یعنی محبت کو ایک حد سے زیادہ خود غرض نہ ہونا چاہیے۔ لیکن یہ تو ہے کہ محبت کرنے والے کی مسرتیں اُس کی کامیابی سے مسلک ہونی چاہیں۔ اگر کوئی شخص کسی خاتون سے محض اس لیے شادی کرنا چاہتا ہے کہ وہ اس خاتون کی خوشیوں کا خواہش مند ہے اور ساتھ ہی ساتھ سمجھتا ہے کہ بیوی بن کر وہ اسے ذات کی قربانی کے بہترین موقع فراہم کرے گی تو پھر میرے خیال میں اس امر پر شہر کیا جاسکتا ہے کہ آیا یہ بات اُس خاتون کے لیے خوشی کا باعث ہوگی۔

بلاشبہ ہمیں اپنے پیاروں کی خوشیوں کی خواہش کرنی چاہیے لیکن یہ خواہش ہماری اپنی مسرتوں کے مقابل کے طور پر نہ ہونی چاہیے۔ اصل میں ذات اور باقی دنیا میں پایا جانے والا تضاد، جو کسر نفسی کے نظریے میں مضمرا ہے، اُس لمحے ختم ہو جاتا ہے جب ہم اپنی ذات کے حصار سے نکل کر افراد یا اشیاء میں کوئی حقیقی دلچسپی لیتے ہیں۔ اس قسم کی دلچسپیوں کے حوالہ سے فرد اپنے آپ کو زندگی کے بہاؤ کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کی حیثیت الگ تھلک پڑے رہنے والے کسی پتھر جیسی نہیں رہتی۔

رنج والم کسی نہ کسی عدم ہم آہنگی سے جنم لیتے ہیں۔ ذات میں یہ صورت حال اب وہ وقت پیدا ہوتی ہے جب شعوری اور لاشعوری ذہن میں ہم آہنگی نہ ہو۔ ذات اور معاشرے میں عدم ہم آہنگی اُس وقت جنم لیتی ہے جب دونوں معروض دلچسپیوں اور محبتیوں کی قوت سے آپس میں بندھے نہ ہوں۔ خوش باش فرد وہ ہوتا ہے جو ہم آہنگی کی ان دونوں میں سے کسی ایک کی ناکامی کا شکار نہیں ہوتا۔ اس کی ذات میں ہم آہنگی ہوتی ہے اور دنیا کے ساتھ بھی۔ ایسا فرد اپنے آپ کو کائنات کا باسی محسوس کرتا ہے۔ وہ اُس کے نظاروں سے اُس کی مسرتوں سے لطف انداز ہوتا ہے اور موت کے تصور سے بے نیاز ہوتا ہے، کیونکہ وہ خود کو بعد میں آنے والوں سے الگ تھلک خیال نہیں کرتا۔ زندگی کے بہاؤ کے ساتھ اس قسم کی گہری جلی وحدت میں ہی عظیم ترین مسرت مضمرا ہے۔

محبت اور زندگی

اکثر معاشروں میں محبت کے بارے میں مختلف رویے رائج ہیں۔ ایک طرف تو محبت شاعری، ناولوں اور ڈراموں کا بنیادی موضوع ہے تو دوسری طرف اکثر سنجیدہ ماہرین عمرانیات اسے مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہیں اور اسے معاشری اور سیاسی اصلاح کے ایجنڈے میں جگہ نہیں دی جاتی۔ میرے نزدیک یہ رویہ جائز نہیں ہے۔ میرے خیال میں محبت انسانی زندگی کی اہم ترین چیزوں میں سے ایک ہے اور میں ہر اس نظام کو ناپسندیدہ سمجھتا ہوں جو اس کی آزادانہ نشوونما میں غیر ضروری رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔

محبت کے لفظ کو مناسب طور پر استعمال کیا جائے تو وہ مرد اور عورت کے تمام باہمی رشتہوں کی نشاندہی نہیں کرتا بلکہ وہ صرف ایک رشتے کی خبر دیتا ہے جس میں بہت سا جذبہ شامل ہوتا ہے اور جو نفسیاتی اور جسمانی دونوں قسم کا رشتہ ہے۔ اس کی شدت بے انت ہے۔ محبت کے جذبے کو فنی اظہار عطا کرنے کی صلاحیت عام نہیں لیکن خود اس جذبے کی، کم از کم برا عظیم یورپ میں، فراوانی ہے۔ بعض معاشروں میں یہ جذبہ زیادہ اور بعض میں کم ملتا ہے۔ اس امر کا انکھار متعلقہ افراد پر نہیں بلکہ رسوم و رواج اور اداروں پر ہے۔ مثال کے طور پر چین میں محبت کا جذبہ بہت ہی کم ملتا ہے اور تاریخ میں بھی یہ ان بدکار چینی شہنشاہوں کے وصف کے طور پر سامنے آتا ہے جن کو داشتاؤں نے بگاڑ دیا تھا۔ روایتی چینی کلچر میں تمام شدید جذبے کو ناپسند کیا جاتا تھا اور فرد کو ہر قسم کے حالات میں عقل کی بالا دستی قائم رکھنے کی تلقین کی جاتی تھی۔

اہل یورپ کا معاملہ مختلف ہے۔ اپنی تاریخ میں وہ رومانی تحریک، انقلاب فرانس اور عظیم جنگوں کے تجربے سے گزرے ہیں، اس لیے وہ خوب جانتے ہیں کہ انسانی زندگی میں فہم و دانش کا کردار اس قدر غالب نہیں جس قدر کہ ملکہ این کے زمانے میں خیال کیا جاتا تھا۔ تخلیل نفسی کے نظریے کی تخلیق کر کے فہم و دانش نے خود اپنے خلاف سرکشی کو مزید فروغ دیا ہے۔ جدید زندگی میں تین اہم ماورائے عقل سرگرمیاں مذہب، جنگ اور

محبت ہیں۔ تاہم محبت عقل دشمن نہیں ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی معقول شخص بھی محبت سے معقول انداز میں لطف انداز ہو سکتا ہے، بعض وجوہ کی بنا پر دنیاۓ جدید میں محبت اور مذہب میں کشاش جاری ہے۔ یہ کشاش ایسی نہیں کہ اس سے چھکارانہ پایا جاسکے۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ بعض دوسرے مذاہب کے بر عکس عیسائیت کی جزیں رہبانت میں پیوست ہیں۔

خیر، آج کی دنیا میں محبت کا ایک اور دشمن بھی ہے جو مذہب سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ دشمن محنت اور معاشری کامیابی کی لگن ہے۔ خاص طور پر امریکہ میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ محبت کو کیریئر میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دینی چاہیے اور اگر کوئی شخص محبت کو اپنے کیریئر پر اثر انداز ہونے کا موقع دیتا ہے تو وہ احمق ہے۔ تاہم دیگر تمام انسانی معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی توازن ضروری ہے۔ محبت کی خاطر کیریئر کو مکمل طور پر قربان کرنا احتمانہ بات ہے، گو بعض صورتوں میں یہ المناک انداز میں ہیر و اندھہ ہو سکتی ہے۔ پھر بھی اس قسم کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ آج کے کسی بنس میں اور خاص طور پر امریکی بنس میں کی زندگی پر نگاہ ڈالیے۔ عقول ان شباب ہی سے وہ اپنے تمام بہترین خیالات اور ساری بہترین صلاحیتیں مال و زر کانے کے لیے وقف کیے ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک دنیا کی دوسری تمام چیزیں فضول ہوتی ہیں۔ جوانی میں وہ اپنی جسمانی ضرورتیں وقت فرط طوالوں کے ذریعے پوری کرتا رہتا ہے۔ پھر وہ شادی کرتا ہے، لیکن اس کی تمام دلچسپیاں اس کی بیوی کی دلچسپیوں سے مختلف ہوتی ہیں اور بیوی کے ساتھ بھی اس کی گہری قربت اور رفاقت پیدا نہیں ہوتی۔ دفتر سے وہ تھکا ہارا دیرے سے آتا ہے اور صبح کو بیوی کے جانے سے پہلے اٹھ جاتا ہے، اتوار کا دن وہ گولف کھیلنے میں بس رکتا ہے، کیونکہ روپیہ کمانے کی دوڑ جاری رکھنے کے لیے ورزش ضروری ہے۔ بیوی کی دلچسپیاں اسے نسوانی باتیں دکھائی دیتی ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ اسے اچھی لگیں، لیکن وہ ان میں شراکت کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔

اس بنس میں کے پاس بیوی کی طرح کسی محبوبہ کے لیے بھی وقت نہیں ہوتا۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ جب وہ اپنے کام کے سلسلے میں گھر سے دور جاتا ہے تو کبھی کبھار کسی طوال کا چکر لگایتا ہے۔ غالباً اس کی بیوی جنسی طور پر اس کے ساتھ سرد مہر رہتی ہے۔ یہ

کوئی اچھیبھے کی بات نہیں۔ اُس کے پاس یوی کی ناز برداریوں کے لیے فرصت ہی نہیں ہوتی۔ لاشعوری طور پر وہ غیر مطمئن رہتا ہے، تاہم اس کا سب اُس کی سمجھیں نہیں آتا۔ وہ اپنی بے چینی سے نجات کے لیے کام پر زیادہ سے زیادہ وقت دیتا ہے یا اس سے چھٹکارا پانے کے لیے دوسرے طریقے تلاش کرتا ہے۔ اُس کی یوی بھی بے چینی کا شکار رہتی ہے۔ اس سے بچنے کے لیے وہ دوسرے درجے کی شفافی سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہے۔

اس طریقے سے میاں یوی دونوں کی جنسی تیکین حاصل کرنے میں ناکامی انسانوں سے نفرت میں ڈھل جاتی ہے۔ تاہم اس نفرت کو بہبود عامہ یا اعلیٰ اخلاقی معیاروں کا لبادہ اوڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ ساری ناگوار صورت حال زیادہ تر ہماری جنسی ضروریات کے غلط تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ بظاہر بینٹ پال اور دوسرے بزرگوں نے یہ فرض کر رکھا تھا کہ شادی کا مقصد صرف جنسی مlap کے لیے موقع فراہم کرنا ہے۔ مذہبی معلمین اخلاق نے بھی اپنی تعلیمات میں اس تصور کو ہوا دی ہے۔ جن سے ان کی نفرت نے جنسی زندگی کے تمام لطیف پہلوؤں کی نگاہوں سے اوچھل کر رکھے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس قسم کے معلمین اخلاق کی تعلیمات سے بچپن میں متاثر ہونے والے لوگ زندگی بھرا پنے بہترین امکانات سے بے خبر رہتے ہیں۔ محبت محض جنسی مlap نہیں، یہ اُس سے بڑھ کر کوئی شے ہے۔ اصل میں محبت اُس تہائی سے فرار کا بڑا اوسیلہ ہے جو اکثر عورتوں اور مردوں پر زندگی کے زیادہ حصے میں چھائی رہتی ہے۔ اکثر لوگوں کے دل کی گہرائیوں میں بے حس دنیا اور دوسرے انسانوں کے ممکنہ جو روستم کا خوف بیٹھا رہتا ہے۔ وہ محبت کی تمنا کرتے ہیں۔ مردوں میں یہ تمنا روکھے پن اور بد تیزی کے روپ میں چھپی رہتی ہے جب کہ عورتوں میں یہ خواہش جھاڑ پھٹکار اور نکتہ چینی کی عادت کا روپ دھار لیتی ہے۔ گہری باہمی محبت جب تک قائم رہتی ہے، وہ اس احساس کو ختم کیے رکھتی ہے۔ اگر محبت کی پتھریلی دیواروں کو توڑ دیتی ہے۔ وہ ایک نئے وجود کو جنم دیتی ہے جس میں دو افراد ایک جان ہو جاتے ہیں۔ فطرت نے انسانوں کو تھا رہنے کے لیے نہیں بنایا۔ ایک دوسرے کی مدد کے بغیر انسان فطرت کے حیاتیاتی مقصد کی تکمیل نہیں کر سکتے اور جہاں تک مہذب انسانوں کا تعلق ہے وہ اپنی جنسی جبلت کی بھرپور تیکین محبت کے بغیر نہیں کر سکتے۔ اس جبلت کی تیکین بھرپور انداز میں اُس وقت تک نہیں ہوتی جب تک جنسی مlap میں انسان کا

ذہن اور جسم دونوں شریک نہ ہوں۔ وہ تمام لوگ زندگی کے بہترین اطف سے محروم رہ گئے ہیں جن کو باہمی مسرت انگیز محبت کی گہری رفاقت اور جذبے کا تجربہ نہیں ہوا۔ شعوری یا لاشعوری طور پر وہ اپنی اس محرومی کو محسوس بھی کرتے ہیں۔ یوں مایوسی اور ناکامی کا احساس پیدا ہوتا ہے جو حسد اور جبر و ظلم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ پُر جوش محبت کو اُس کا جائز مقام دینا ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں ماہرین عمرانیات کو دلچسپی لینی چاہیے، وجہ یہ ہے کہ اس تجربے سے محروم رہنے والے مرد اور عورت اپنی ذات کی تکمیل نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان میں دوسرے انسانوں، سماج اور دنیا کے بارے میں ثابت اور صحت مند جذبے پیدا ہو سکتے ہیں۔

حالات سازگار ہوں تو اکثر مردوں اور عورتوں کو زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر جوشی محبت کا تجربہ ہوتا ہے تا ہم غیر تجربہ کار لوگوں کو پُر جوش محبت اور محض جنسی کشش میں انتیاز کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ یہ مشکل خاص طور پر ان لڑکیوں کو پیش آتی ہے جن کی تربیت خاص طور پر ہوئی ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں یہ درس دیا جاتا ہے کہ جب تک انہیں کسی مرد سے محبت نہ ہو، اُسے چونما نہیں چاہیے اگر کسی لڑکی سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ شادی کے وقت تک وہ کنواری ہو تو پھر وہ عارضی اور لحاظی جنسی کشش کے دام میں اکثر اوقات الجھتی رہے گی، حالانکہ جنسی طور پر تجربہ کا رکوئی عورت اُسے آسانی سے محبت سے ممیز کر سکتی ہے۔

بلاشبہ یہ امر غیر مسرت انگیز شادیوں کا بُر اسہب بنتا ہے۔ باہمی محبت اگر موجود ہو تو بھی یہ خیال اُسے زہر آلو کر دیتا ہے کہ یہ محبت گناہ آلو دہے۔ بسا اوقات اس احساس کا مناسب جواز موجود ہوتا ہے، لیکن یہ احساس بلا جواز ہو تو بھی محبت میں زہر بھرے بغیر نہیں رہتا۔ محبت کے تمام ثرات سے اطف انداز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ آزاد، فیاض، بلارکاوش اور پُر خلوص ہو۔

روایتی تعلیم محبت کو گناہ کے احساس سے آلو دہ کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ازدواجی محبت میں بھی عورتوں اور مردوں دونوں میں لاشعور طور پر یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پرانی روایت سے نسلک رہنے والوں کے ساتھ ساتھ ایسے لوگ بھی اس کی زد میں آ جاتے ہیں جو شعور کی سطح پر آزاد خیال ہوتے ہیں۔ اس رویے کے اثرات

مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ عموماً یہ اثرات مردوں کو جنسی اختلاط کے معاملے میں بے حس، بے ڈھنگا اور بے درد بنادیتی ہیں، کیونکہ وہ عورت کے احساسات جانے کے لیے اپنے اندر اس کے بارے میں بات کرنے کی ہمت نہیں پاتے اور نہ ہی وہ عورت کو جنس سے لطف اٹھانے کے بھر پور موقع مہیا کر سکتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اکثر اوقات احساس ہی نہیں ہوتا کہ عورت کو بھی اس ملأپ سے لطف اندوں ہونا چاہیے اور یہ کہ اگر وہ یہ لطف حاصل نہیں کر پاتی تو اس میں قصور اس کے مرد کا ہے۔

روایتی تعلیم پانے والی عورتیں عموماً سردمہری میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ وہ جسمانی طور پر لیے دیئے رہتی ہیں اور جسمانی قرب کو آسانی سے قبول نہیں کرتی ہیں۔ ماہر مردوں کی کمزوریوں پر آسانی سے قابو پالیتا ہے لیکن جو مرد اس رویے کو پاک بازی کی علامت خیال کرتا ہے اور اس کا احترام کرتا ہے، وہ ناکام رہ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شادی کے کئی برس بعد میاں بیوی کے تعلقات میں کھچاؤ رہتا ہے اور وہ کم و بیش رسمی سے رہتے ہیں۔ ہمارے داداوں کے زمانے میں شوہر کبھی اپنی بیویوں کو برہنہ دیکھنے کی امید نہ رکھتے تھے اور کبھی اگر وہ ایسی خواہش کا اظہار کر دیتے تو بیویوں کا ڈر کے مارے دم نکل جاتا۔ یہ رو یہ آج بھی اس سے زیادہ موجود ہے جتنا کہ ہم سمجھتے ہیں۔ اس حد کو پار کر جانے والے لوگوں کے رویوں اور طرزہائے عمل میں بہت سی پرانی رکاوٹیں موجود ہیں۔

جدید دنیا میں محبت کی مکمل نشوونما میں ایک اور نفسیاتی رکاوٹ بھی موجود ہے۔ اس رکاوٹ کا تعلق بہت سے لوگوں کے اس خوف سے ہے کہ وہ اپنی انفرادیت برقرار نہیں رکھ سکتے۔ یہ ایک جدید اور احمقانہ خوف ہے۔ انفرادیت بجائے خود مقصود نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو دنیا کے ساتھ بار آؤ اور رشتے میں شامل ہونا چاہیے اور اس عمل میں اپنی علیحدگی کو ختم کرنا چاہیے۔ جس انفرادیت کو شمشئے کے صندوق میں بند کر دیا جاتا ہے، وہ مر جھا جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر اس کو انسانی رشتہوں میں آزادانہ شرکت کا موقع دیا جائے تو وہ پھلتی پھلوتی ہے۔ محبت، بچے اور محنت فردا اور باقی دنیا کے درمیان ناطے کو مضبوط بنانے کے موثر ذرائع ہیں۔ ان میں سے محبت کو عموماً اولیت حاصل ہے۔ مزید برآں والدین کی شفقت کی بہترین نشوونما کے لیے بھی یہ لازمی ہے۔ بات یہ ہے کہ بچے تو مان باپ دونوں کے نقش قدم پر ہی چلتے ہیں۔ ماں باپ اگر ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے

تو بچے میں باپ کی صفات نمایاں ہوں گی تو باپ خوش ہوگا اور ماں رنجیدہ ہوگی اور اگر ماں کی خصوصیات نمایاں ہوئیں تو ماں کو خوشی ہوگی اور باپ کو رنج ہوگا۔ یہ ضروری نہیں کہ محنت ہمیشہ بیرونی دنیا کے ساتھ فرد کا باشرشہ قائم کرنے میں کامیاب ہو۔ اصل میں اس کا انحصار اس امر پر ہے کہ محنت کس انداز میں کی جاتی ہے۔ کام کا ج اگر صرف روپے پیسے کی خاطر کیا جائے تو پھر اس قسم کا رشتہ نہیں بناتا، ہاں اگر اس میں کوئی جاں ثاری، کوئی وابستگی۔۔۔ مثلاً افراد سے، اشیاء سے کسی وژن سے وابستگی۔۔۔ شامل ہو تو یہ رشتہ قائم ہو سکتا ہے۔ محبت بھی اگر محض ملکیت کے احساس پر مبنی ہو تو وہ فضول ہوا کرتی ہے۔ جس قدر رکا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں وہ محبت میں صرف اس وقت شامل ہوتی ہے جب دوسرے فرد کی شخصیت کو اپنی شخصیت جتنا ہم خیال کیا جائے اور دوسرے کے احساسات اور خواہشات کی اُسی طرح تکمیل کی جاتی ہے، گویا خودی کے احساس کی محض شعوری سطح پر نہیں بلکہ جملی طور پر بھی یوں توسعہ ہو کہ دوسرا فرد بھی اُس کا حصہ بن جائے۔ بے رحم مقابلے کے ہمارے معاشرے، پروٹوٹوٹ ازم سے اخذ شدہ احقانہ شخصیت پرستی اور رومانوی تحریک نے مل کر اس قسم کی محبت کو دشوار بنادیا ہے۔

جس سنجیدہ قسم کی محبت کا یہاں ہم ذکر کر رہے ہیں، وہ نئے دور کے آزاد خیال لوگوں کے ہاتھوں ایک نئے خطرے سے دوچار ہے۔ جنسی ملاپ کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہے اور مادر پر آزاد ہو جائے تو پھر جنس کا سنجیدہ جذبے اور چاہت کے احساس سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا رابطہ نفرت کے جذبے ہو جائے۔ آئدوس ہکسلے کے ناولوں میں اس قسم کے معاملے میں واضح مثالیں ملتی ہیں۔ سینٹ پال کی طرح ہکسلے کے کردار بھی جنسی اختلاط کو محض فریا لو جیکل اخراج خیال کرتے ہیں اور وہ اُن اعلیٰ اقدار سے بے خبر دکھائی دیتے ہیں جن کے ساتھ اس اختلاط کو منسلک کیا جاسکتا ہے۔ رہبائیت اس سے صرف ایک قدم ہی آگے ہے، محبت کے اپنے مخصوص آدراش اور اخلاقی معیار ہیں جو نہ ہی تعلیمات اور ہر قسم کی جنسی اخلاقیات کے خلاف نئی نسل میں خاصی حد تک مقبول ہونے والی بغاوت، دونوں میں دھندا جاتے ہیں۔ جنسی ملاپ کو اگر محبت سے الگ تھلک کر دیا جائے تو پھر وہ گھرے طور پر جبلت کی تسکین کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ خیر، میں یہ نہیں کہتا کہ کسی شخصیت کی محبت کے بغیر جنسی ملاپ نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس صورت

میں ہمیں ایسی شرائط لاؤ کرنا پڑیں گی کہ خود محبت بھی بہت دشوار ہو جائے گی، میں بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ محبت کے بغیر جنسی مlap بہت کم قدر کا حامل ہے۔

انسانی زندگی میں موزوں مقام سے متعلق محبت کے دعوے بہت بڑے ہیں لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ محبت ایک نرالی قوت ہے۔ اگر اسے آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ قانون یا رواج کی حدود میں بند نہیں رہتی۔ بچوں کا معاملہ نہ ہو تو پھر یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن جو نبی بچوں کا معاملہ شامل ہو جائے تو صورت حال یکسر بدل جاتی ہے کیونکہ اس صورت میں محبت خود مختار نہیں رہتی بلکہ نسل کے حیاتیاتی مقاصد کی تکمیل بن جاتی ہے۔ بلاشبہ بچوں کے بارے میں سماجی اخلاقیات کی ضرورت ہے جو کوئی تضاد پیدا ہونے کی صورت میں پُر جوش محبت کے تقاضوں کو مسٹر کر سکے۔ تاہم ایک اچھا اخلاقی نظام ہو گا جو اس تضاد کو کم سے کم رکھ سکے، محسن اس لیے نہیں کہ محبت بجائے خود اچھی چیز ہے بلکہ اس لیے بھی کہ ماں باپ ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہوں تو یہ بات بچوں کے لیے اچھی ہوتی ہے۔ دانش مندانہ جنسی اخلاقی نظام کا ایک بڑا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ محبت میں اس قدر کم دخل اندازی کو یقینی بنا جائے جو بچوں کے مفادات سے ہم آہنگ ہو۔

شادی

یہاں ہم بچوں کے حوالے کے بغیر مغض عورت اور مرد کے مابین ایک تعلق کے طور پر شادی کو موضوع بحث بنائیں گے۔ دیگر جنسی تعلقات سے شادی اس لحاظ سے مختلف ہے کہ یہ ایک قانونی ادارہ ہے۔ اکثر معاشروں میں اسے مذہبی ادارے کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ تا ہم اس کا قانونی پہلو نہیادی ہے۔ قانونی ادارہ مغض ایک ایسے رواج کی صورت گری کرتا ہے جو نہ صرف عہد قدم کے انسانوں بلکہ بوزنوں اور کسی جانوروں میں پایا جاتا ہے جانوروں کی دنیا میں جہاں کہیں بچوں کی پال پوس کے لیے نرکا تعادن درکا ہو، وہاں نر اور مادہ میں ایسا رشتہ قائم ہوتا ہے جس کو ہم شادی کا عنوان دے سکتے ہیں۔ حیوانوں میں عام طور پر یہ زوجی کا رواج ہے اور بعض ماہرین کے نزد یہ انسان نما بوزنوں میں یہ رواج خاص طور پر پایا جاتا ہے۔ اگر ماہرین کا یہ دعویٰ درست ہے تو گویا ان خوش قسمت حیوانوں کو وہ مسائل درپیش نہیں ہوتے جو انسانی معاشروں میں ہلچل مچائے رکھتے ہیں، کیونکہ جب کسی نر جانور کا تعلق اپنی مادہ سے بن جاتا ہے تو کوئی دوسری مادہ اس میں دلچسپی نہیں لیتی۔ اس طرح جب کسی مادہ کا تعلق ایک نر سے بن جاتا ہے تو دوسروں کے لیے اس میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان نما بوز نے مذہب کے بغیر ہی گناہ سے محفوظ رہتے ہیں۔ ان میں خود جبلت ہی پاک بازی پیدا کر دیتی ہے۔ اس امر کی تھوڑی بہت شہادت ملتی ہے کہ وحشی انسانوں کی کم ترین نسلوں میں بھی اس قسم کی صورت حال پائی جاتی ہے۔ مہذب انسانوں میں بھی کبھی کبھار یہ زوجی جبلت کے آثار دکھائی دے جاتے ہیں۔ کردار پر عادت کے اثر کو پیش نظر رکھا جائے تو شاید یہ بات حیران کن دکھائی دیتی ہے کہ جبلت پر یہ زوجی کا اثر زیادہ نہیں ہے۔ خیر، یہ انسانوں کے ذہنی امتیاز کی ایک مثال ہے اس سے صرف گناہ ہی جنم نہیں لیتے بلکہ ذہانت بھی ابھرتی ہے، کیونکہ ذہانت سے مراد تخلیل کی قوت ہے جو عادتوں پر قابو پا کر طرز عمل کی نئی راپیں سامنے لاتی ہے۔

قدم یہ زوجی کے رواج کو پہلے پہل غالباً معاشری محرک نے ضعف پہنچایا تھا۔

معاشی محرک جہاں کہیں جنسی کردار پر اثر انداز ہوتا ہے، اُس کے اثرات ہمیشہ تباہ کن ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ جلت پر میںی رشتوں کی جگہ غالباً اور خرید کے رشتوں کو نافذ کر دیتا ہے۔ قدیم زرعی اور چواہوں کے گروہوں میں یویاں اور بچے مرد کے لئے معاشی اٹاٹہ ہوا کرتے تھے۔ یویاں اُس کے لئے کام کا ج کرتی تھیں اور پانچ چھ برس کی عمر کے بعد بچے بھی اُس کا ہاتھ بٹانے لگتے تھے۔ اس لئے طاقتور مرد زیادہ سے زیادہ یویاں حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کسی معاشرے میں ایک سے زیادہ یویاں رکھنے کا رواج عام صورت اختیار نہیں کر سکتا کیونکہ عورتوں کی تعداد عموماً مردوں سے بہت زیادہ نہیں ہوا کرتی۔ زیادہ یویاں صرف سردار اور امیر لوگ ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ زیادہ یویاں اور بچے قیمتی جائیداد بن جاتے ہیں اس لئے وہ اپنے آقاوں کی شان و شوکت میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ بنیادی طور پر یوی ایک مفید گھریلو جانور بن کر رہ جاتی ہے۔ اُس کے جنسی و نسلی کو ٹانوی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ تہذیب و تدمن کے اس مرحلے پر مرد کے لئے یوی کو طلاق دینا آسان ہو جاتا ہے۔ البتہ اس امر پر پابند کیا جاسکتا ہے کہ وہ یوی کا لایا ہوا جیزیر بھی طلاق کے وقت اُسے واپس کرے۔ تاہم یوی کو عموماً یہ اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ اپنے شوہر کو طلاق دے دے۔

اکثر نیم مہذب معاشروں میں بدکاری کے بارے میں رو یہ اسی نقطہ نظر سے پیدا ہوتا ہے۔ تہذیب کی بہت سی پست سٹھ پر بسا اوقات بدکاری کو برداشت کر لیا جاتا ہے، مثلاً ہمیں بتایا گیا ہے کہ جب کبھی سامون لوگ سفر پر جایا کرتے تھے تو وہ موقع رکھتے تھے کہ ان کی غیر حاضری میں ان کی یویاں اور دوسرے جنسی تسلیم حاصل کرتی رہیں گی۔ تاہم تہذیب کی اس سے قدرے بلند سٹھ پر عورتوں کو بدکاری کی اجازت نہیں دی جاتی اور اس کی سزا موت یا بہت ہی سخت سزا میں دی جاتی ہیں۔ میرے عنوان شباب میں منگو پارک کا بیان کردہ ممبوجہ کا قصہ بہت مشہور تھا۔ تاہم حال ہی میں مجھے یہ جان کر دکھ ہوا کہ نک چڑھے امریکی ججو کو منگو کا ایک دیوتا خیال کرتے ہیں۔ اصل میں وہ دیوتا تھا اور نہ ہی اُس کا تعلق کا منگو سے تھا۔ وہ تو بس جھوٹ موت کا بھوت تھا جو اپنا بھر کے لوگوں نے اپنی بدکار عورتوں کو ڈرانے کے لئے تخلیق کیا تھا۔ منگو پارک کے بیان کردہ قصے

میں مذہب کے منع سے متعلق والیٹ کے نقطہ نظر کی اس قدر واضح جھلک ملتی ہے کہ ان جدید ماہرین بشریات نے اس قصہ کو دبانے کی کوشش کی ہے، جو وحشیوں کے اعمال میں معقول قسم کی بدمعاشی کا کوئی عصر قبول نہیں کر سکتے۔ کسی دوسرے کی بیوی کے ساتھ بدکاری کرنے والے کو وہاں بلاشبہ مجرم گر دانا جاتا تھا۔ لیکن کسی دو شیزہ کے ساتھ منہ کالا کرنے والے کو کوئی الزام نہ دیا جاتا تھا۔ بشرطیکہ اس فعل سے اُس لڑکی کی شادی کے نقطہ نظر سے قدر و قیمت کم نہ ہو۔

عیسائیت کی آمد نے اس صورت حال کو بدل دیا۔ اُس نے شادی میں مذہب کا کردار بڑھا دیا اور شادی کے قانون کی خلاف ورزی جائیداد کے بجائے تابو (تحريم) کی بنیاد پر قابل سزا قرار پائی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مذہب نے بھی کسی دوسرے شخص کی بیوی کے ساتھ مبارشت کو اس شخص کے خلاف جرم قرار دیا۔ لیکن اُس نے یہ تعلیم بھی دی کہ بیوی کے سوا کسی اور عورت سے جنسی تعلق خدا کے خلاف جرم ہے۔ مذہب کے نزدیک یہ بہت بڑا جرم ہے۔ بھی چرچ نے اس کے لئے سخت سزا میں مقرر کیں۔ مردوں کے پاس طلاق دینے کا جو حق تھا، چرچ نے اسے منسوخ کر دیا۔ شادی کو عمر بھر کا عہد و پیمان قرار دے دیا گیا۔

اس امر کا فیصلہ کرنا بہت دشوار ہے کہ اس تبدیلی سے انسانی مسروں میں اضافہ ہوایا کمی ہوئی۔ کسانوں میں شادی شدہ عورتوں کی زندگی ہمیشہ ہی بہت سخت رہی ہے اور کم مہذب کسانوں میں ان عورتوں کی زندگی مجموعی طور پر سخت ترین ہوتی ہے۔ اکثر وحشی اقوام میں عورت پچیس برس کی عمر میں بوڑھی ہو جاتی ہے اور اُس میں دلکشی کی کوئی جھلک باقی نہیں رہتی۔ عورتوں کو گھر بیلو جیوان قرار دینے کا تصور مردوں کے لئے بلاشبہ بہت خوش گوار تھا، لیکن عورتوں کے لیے اس کا مطلب مختنوت اور مشقتوں کی سخت زندگی تھا۔ عیسائیت نے بعض حوالوں سے عورتوں کی حالت اور بھی ابتر بنا دی۔ خاص طور پر کھاتے پیتے طبقے کی عورتوں کی حالت خراب تر ہو گئی۔ تاہم عیسائیت نے مردوں کے ساتھ عورتوں کی دینی برادری کو تسلیم بھی کیا اور انہیں محض اپنے شوہروں کی جائیداد ماننے سے انکار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ کوئی عورت کسی اور مرد کے لئے اپنے شوہر کو چھوڑنے کا حق نہ رکھتی تھی، تاہم وہ مذہبی زندگی کے لیے شوہر کی تیاگ سکتی تھی۔

جب ہم آج کی دنیا پر نگاہ ڈالتے ہیں اور اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں کہ

ازدواجی مسروتوں اور ازدواجی رنجشوں کے عمومی اسباب کون کون سے ہیں، تو کس قدر عجیب و غریب نتائج سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ زیادہ مہذب لوگوں کے لیے کسی ایک شریک حیات کے ساتھ زندگی بھر کی پر مسروت زندگی دشوار ہوتی ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک آرٹش کسانوں کی شادیاں ماں باپ طے کیا کرتے تھے۔ ان کو جانے والے لوگوں کا کہنا تھا کہ ان کسانوں کی ازدواجی زندگیاں عموماً خوش گوار اور صالح تھیں۔

عام بات یہ ہے کہ جہاں لوگوں میں فرق کم ہوا وہاں ازدواجی زندگی بہتر ہوتی ہے۔ جب ایک مرد دوسرے مردوں سے بہت کم مختلف ہوا اور کوئی عورت دوسری عورتوں سے ملتی جلتی ہو تو پھر اپنی ازدواجی زندگی سے غیر مطمئن رہنے اور اس بات کا افسوس کرنے کا کوئی خاص موقع نہیں ہوتا کہ شادی کسی اور سے کیوں نہیں ہوئی۔ اس کے برخلاف جہاں ذوق، خواہشوں اور دلچسپیوں میں بہت فرق ہوا وہاں ایک خاص قسم کے شریک حیات کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور جب مرضی کے فرد سے شادی نہ ہو تو ازدواجی بے اطمینانی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیسا کامالہ یہ ہے کہ وہ ازدواجی زندگی کو صرف جنس کے حوالے سے دیکھتا ہے۔

لہذا اسے اس بے اطمینانی کا سبب سمجھ میں نہیں آتا اور وہ شادی کے ناقابل تنشیخ ہونے پر اصرار کرتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ مرضی کا شریک حیات نہ ملے پر ازدواجی زندگی اکثر اوقات بہت کٹکٹھن ہو جاتی ہے۔

اگر غیر شادی شدہ عورتوں کی تعداد زیادہ نہ ہوا اور شادی شدہ مردوں کو معزز عورتوں سے میل جوں کے سماجی موقع حاصل نہ ہوں تو بھی ازدواجی زندگی کو پر سکون بنانے میں مدد مل سکتی ہے۔ بیوی کے علاوہ دوسری عورتوں کے ساتھ چنسی تعلقات کا امکان موجود نہ ہو تو مساوائے نہایت بد کار مردوں کے اکثر مرد اس صورت حال سے سمجھوئہ کر لیں گے اور ان کی خانگی زندگی پر مسروت ہو جائے گی۔ اس بات کا اطلاق بیویوں پر بھی ہوتا ہے بشرطیہ وہ شادی سے زیادہ مسروت کی توقعات وابستہ نہ کریں تو ازدواجی زندگی زیادہ خوش گوار ہو سکتی ہے۔

اسی حوالے سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ سماجی رواج کا استقلال بھی ناخوش گوار ازدواجی زندگی کو روکنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ شادی کے بندھن کو اگر حتمی اور ناقابل تنشیخ تعلیم کر لیا جائے تو پھر تخلیک کو اس کی حدود سے تجاوز کرنے کا محکم نہیں ملتا اور نہ

ہی یہ پچھتا و اپیدا ہوتا ہے کہ اگر شادی کسی اور جگہ ہوتی تو زیادہ خوشیاں نصیب ہو سکتی تھیں، جہاں کہیں اس قسم کی ذہنی کیفیت موجود ہو، وہاں گھر بیوی امن قائم رکھنے کے لئے بس یہ ضروری ہے کہ میاں بیوی دونوں میں سے کوئی بھی شاستہ کردار کے عمومی معیار سے نیچے نہ گرے۔

جدید دنیا کے مہذب لوگوں میں ازدواجی زندگی کو پُر مسرت بنانے والی ان شرائط میں ایک بھی نہیں پائی جاتی۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ شادی کے پہلے چند برسوں کے بعد کم ہی لوگوں کو خوش باش ازدواجی زندگی نصیب ہوتی ہے۔ عدم مسرت کے بعض اسباب کا تعلق تہذیب سے ہے۔ تاہم بعض دیگر اسباب ایسے ہیں کہ اگر مرد اور عورتیں زیادہ مہذب ہو جائیں تو وہ اسباب بھی ختم ہو جائیں گے۔

آئیے ہم دوسری قسم کے اسباب سے آغاز کرتے ہیں۔ اس قسم کے اسباب میں سے اہم ترین بڑی جنسی تعلیم ہے۔ کھاتے پیتے لوگوں میں اس قسم کی تعلیم کا رواج کسانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ کسانوں کے بچے نو عمری ہی میں ان باتوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں جن کو ہم زندگی کے حقائق کہتے ہیں۔ ان حقائق کا مشاہدہ نہ صرف انسانوں بلکہ حیوانوں میں بھی کر لیتے ہیں۔ اس طرح وہ جہالت اور تنگ مزاجی دونوں سے بچ بھی جاتے ہیں۔ دوسری طرف امیر گھر انوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت میں بڑی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے اور انہیں جنسی معاملات کے عملی علم سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جدید طرز کے والدین جو بچوں کو کتابیں پڑھاتے رہتے ہیں وہ بھی انہیں عملی قربت کا احساس حاصل کرنے نہیں دیتے جو کسان بچے نو عمری میں حاصل کر لیتے ہیں۔ میکی تعلیمات کا تقاضا یہ ہے کہ مرد اور عورت پہلے سے کوئی جنسی تجربہ رکھے بغیر ازدواجی زندگی میں قدم رکھیں۔ اس قسم کی شادیوں کی بڑی تعداد میں متوجہ خوش گوار نہیں ہوتے۔ انسانوں میں جنسی طرز عمل جبلی نہیں ہوتا۔ اس لئے غیر تجربہ کار دو لہا اور دو لہن پر، جو غالباً اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتے، شرم اور بے چینی کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ عورت اگر باعصمت ہو لیکن مرد نے طوائفوں کے دیلے سے ان امور کا علم حاصل کر لیا ہو تو صورت حال قدرے بہتر ہو جاتی ہے۔ اکثر مردوں کو یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ شادی کے بعد عورت کو آمادہ کرنے کے لئے کوشش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح بہت سی عورتیں ہیں کہ جن کی

پرورش اچھی ہوتی ہے، لیکن وہ نہیں جانتیں کہ سردمہر اور جسمانی طور پر لاتعلق رہ کر وہ اپنی ازدواجی زندگی کو کس قدر نقصان پہنچاتی ہیں۔

بہتر جنسی تعلیم کے ذریعے ان خامیوں کو دور کیا جاسکتا ہے۔ اگر بات یہ ہے کہ اس معاملے میں آج کے نوجوان اپنے باپ دادا کی نسل سے بہتر ہیں۔ گزرنے ہوئے زمانے میں عام طور پر عورتیں سمجھتی تھیں کہ چونکہ وہ جنس سے کم لطف حاصل کرتی ہیں اس لئے وہ اخلاقی لحاظ سے مردوں سے بہتر ہیں۔ اس روایے نے میاں بیوی کے مابین بے تکلفانہ رفاقت کو محال بنارکھا تھا۔ بجائے خود بھی یہ تصور بلا جواز تھا، کیونکہ جنس سے لطف اندوز ہونے میں ناکامی پا کیا تھی کی علامت نہیں بلکہ کسی جسمانی یا نفسیاتی خامی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ بات دیسے ہی ہے جیسے کوئی شخص خوراک سے لطف نہ اٹھا سکے۔ خیر، سوسال پہلے نفسی اور مہذب عورتوں سے یہ موقع بھی کی جاتی تھی کہ وہ کھانے پینے سے بھی لطف اندوز نہ ہوں گی۔

خوش گوار ازدواجی زندگی میں حائل ہونے والی دوسری تینی رکاوٹوں کو دور کرنا آسان نہیں ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ خوش باش مہذب مرد اور عورتیں ایک سے زیادہ افراد کے ساتھ جنسی تعلق رکھنے کا جلیل رہ جان رکھتی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ انہیں کسی کے ساتھ شدید قسم کی محبت ہو جائے اور چند برسوں تک وہ کسی اور کسی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں۔ لیکن جلد یا بدیر وہ ایک ہی فرد کے ساتھ جنسی رفاقت سے اکتا جاتے ہیں اور پرانا جوش و خروش بحال کرنے کی خاطر تاک جھانک شروع کر دیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ہو سکتا ہے کہ اخلاقی اصولوں اور رضا باطلوں کی خاطر اس تحریک پر قابو پالیا جائے، لیکن اُسے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ عورتوں کی آزادی کے سبب میاں بیوی کو ایک دوسرے کے ساتھ جنسی بے وفائی کے موقع پہلے کے مقابلے میں زیادہ دستیاب ہو گئے ہیں۔ موقع خیال کو تمدن دیتا ہے اور خیال سے خواہش پیدا ہوتی ہے۔ جہاں مذہبی پابندیاں نہ ہوں وہاں خواہش سے عمل کی طرف راہ بن جاتی ہے۔

عورتوں کی آزادی نے کئی حوالوں سے شادی کے لیے مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ پرانے وتوں میں بیوی اپنے آپ کو شوہر کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لیتی تھی، لیکن شوہر کو ضرورت نہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو بیوی کی خواہشوں کے مطابق ڈھالے۔

اب بہت سی عورتیں اپنی انفرادیت اور اپنے کیریئر کو عزیز رکھتی ہیں۔ لہذا وہ ایک حد سے زیادہ اپنے آپ کو شوہر کی مرضی سے ہم آہنگ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں۔ دوسری طرف بوسیدہ روایت کے دامن سے بندھے ہوئے بہت سے مرد اپنے آپ کو تبدیل کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ بے وفائی کے معاملے میں یہ مشکل خاص طور پر پیدا ہوتی ہے۔ ایام گزشتہ میں شوہر گاہے بگاہے جنسی بے وفائی کا ارتکاب کرتے تھے، لیکن عموماً یوں کو خبر نہ ہوتی تھی۔ خبر ہو بھی جاتی تو شوہر اعتراف گناہ کر لیتا اور یوں کو یقین دلاتا کہ اُسے اپنے اس فعل پر شرمندگی ہوئی ہے اور وہ تائب ہو گیا ہے۔ اُس ماحول میں یوں عام طور پر پاک باز ہوتی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور شوہر کو یوں کی کرت تو توں کا پتہ چل جاتا تو شادی کا بندھن ختم ہو جاتا۔ کئی جدید شادیوں میں میاں یوں ایک دوسرے سے جنسی وفاداری کا مطالبہ نہیں کرتے لیکن رقبت کی جلت ابھی تک قائم چلی آتی ہے۔ چنانچہ میاں یوں میں ہنگامہ آرائی نہ ہو تو بھی یہ جلت اُن میں گھری قربت کو نقصان پہنچاتی ہے۔

جدید ازدواجی زندگی میں ایک اور بھی دشواری موجود ہے جس کو خاص طور پر محبت کی قدر کا گہر اشکور رکھنے والے لوگ محسوس کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ محبت صرف اُس وقت پھول پھول سکتی ہے جب کہ وہ آزاد اور بے ساختہ ہو۔ جب اُسے فرض سمجھ لیا جائے تو وہ ختم ہونے لگتی ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ فلاں فرد سے محبت کرنا آپ کا فرض ہے تو گویا اُس فرد سے یقینی نفرت کی بنیاد رکھ دی جاتی ہے۔ چونکہ ازدواجی زندگی محبت اور قانونی بندھن کا امترانج ہوتی ہے لہذا اُس میں یہ دونوں باتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ شیئے نے اس صورت حال کو خوب بیان کیا ہے:

I never was attached to great sect
Whose doctrine is that each one should select
Out of the Crowd a mistress or a friend,
And all the rest, though wish and good, commend
To cold oblivion, though it is the code
Of modern morals, and the beaten road
Which those poor slaves weary footsteps tread
Who travel to their home among the dead
By the broad highway of the world, and so

With one chain'd friend, perhps a jealous foe,
The dreariest and the longest journey go.

اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر شادی محبت کی دوسری تمام را ہیں مسدود کر دے تو اثر پذیری، ہمدردی اور بیش قدر انسانی رابطے بھی مسدود ہو جاتے ہیں۔ یہ طرز عمل اُس شے کے لیے نقصان دہ ہے جو سب سے زیادہ آ درش پسند نظر سے بجائے خود پسندیدہ ہے۔ علاوہ ازیں بندش اور جری اخلاق کی دوسری تمام اقسام کی طرح یہ طرز عمل بھی انسانی زندگی کے بارے میں پولیس میں جیسے نقطہ نظر کو فروغ دیتا ہے۔ اس سے مراد وہ نقطہ نظر ہے جو ہمیشہ کسی کسی امر سے روکنے کے موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔

ان اسباب کی بنا پر ازدواجی زندگی مشکلات کی گھرگنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے کئی اسباب اچھی چیزوں سے مسلک ہیں لیکن شادی کو اگر خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ نہیں بناتا تو پھر ضروری ہے کہ اُس کا نئے انداز سے تصور کیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک حل عموماً پیش کیا جاتا ہے اور امریکہ میں وسیع پیانے پر اُسے بروئے کا رجھی لایا گیا ہے۔ وہ حل طلاق کو آسان بنانا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ طلاق کے معاملے میں ہمارے قوانین سخت گیر ہیں اور یہ کہ طلاق کو زیادہ سہل ہونا چاہیے لیکن میرے نزدیک طلاق کے مسائل کا حل نہیں ہے۔ جہاں بچے نہ ہوں وہاں طلاق مسئلے کا صحیح حل ہو سکتی ہے۔ لیکن بچوں کی موجودگی میں شادی کے بندھن کا استحکام میرے نزدیک خاصاً ہم معاملہ ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اگر شادی باشہر ہو اور میاں یوں دونوں معقول اور نفسی انسان ہوں تو پھر توقع یہ ہونی چاہیے کہ ان کے لئے شادی زندگی بھر کی رفاقت ثابت ہوگی۔ البتہ یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ جنسی طور پر بھی ایک دوسرے کے ہمیشہ وفادار رہیں گے اور ازدواجی بندھن سے باہر جنسی تعلقات نہیں رکھیں گے۔ اگر کوئی شادی جذباتی محبت سے شروع ہوتی ہے اور ایسے بچوں کو جنم دیتی ہے جن کی آرزو کی جاتی ہے اور جن سے محبت بھی کی جاتی ہے، تو پھر اس شادی کو میاں یوں کے درمیان ایسا گھر ارثتہ پیدا کرنا چاہیے جو جنسی خواہش میں کسی کے بعد بھی قائم رہے اور وہ دونوں اُس وقت بھی باہمی رفاقت کے دلدادہ رہیں جب انہیں یا ان میں سے کسی ایک کو کسی اور کسی کی جنسی خواہش محسوس ہونے لگے۔ شادی کی اس چاشنی میں رفاقت نے زہر گھول رکھا ہے۔ بہر طور ہمیں پادرکھنا چاہیے کہ اگرچہ رفاقت ایک جملی جذبہ ہے لیکن اُسے جائز اخلاقی غیظ و غضب کے اظہار کے

مجائے پر اسکھا جائے تو اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ جو رفاقت برسوں سے قائم ہوا اور جس نے زندگی کے طوفانوں کا مقابلہ کیا ہو، اس میں ایسی وسعت اور گہرائی پیدا ہو جاتی ہے جو محبت کے ابتدائی ایام میں موجود نہیں ہوتی، حالانکہ یہ ابتدائی ایام بہت مسٹ انگیز ہو سکتے ہیں۔ جس شخص کو ماضی اور یادوں کی اہمیت کا احساس ہو، وہ اس گہری رفاقت کو کسی نئی محبت کی خاطر آسانی سے ختم نہیں کر سکتا۔

اس ساری بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مہذب عورتوں اور مردوں کے لئے ازدواجی زندگی پر مسٹ ہو سکتی ہے، تاہم اس سلسلے میں انہیں کئی شرائط پوری کرنا ہوں گی۔ فریقین میں مساوات کا احساس ہونا ضروری ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی آزادی میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ دونوں میں مکمل جسمانی اور ذہنی قربت ہونی چاہیے۔ اسی طرح اقدار کے معیار کے معاملے میں بھی دونوں میں ایک خاص حد تک اتفاق ہونا چاہیے۔ (مثال کے طور پر یہ صورت حال پسندیدہ نہیں ہو گی کہ میاں بیوی میں سے ایک کے نزدیک صرف روپیہ بیسہ اہم ہو اور دوسرا صرف اچھے کاموں کو اہمیت دیتا ہو) یہ حالات پیدا ہو جائیں تو پھر میرے نزدیک شادی دو انسانوں کے مابین بہترین اور اہم ترین رشتہ بن سکتی ہے۔ اگر شادی اب تک اس قسم کا رشتہ نہیں بن سکی ہے تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ میاں بیوی اپنے آپ کو ایک دوسرے کا سفتری خیال کرتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ شادی کے امکانات کی تکمیل صرف اس وقت ممکن ہے جب میاں بیوی یہ جان لیں کہ قانون کے قاضے چاہے کچھ ہوں، لیکن اپنی تجھی زندگی میں انہیں لازماً آزاد ہونا چاہیے۔

رومانوی محبت

دنیاے قدیم اگرچہ ناگوار تھی، لیکن دھشانہ نہ تھی۔ عیسائیت اور وحشیوں کی کامیابی سے البتہ زن و مرد کے تعلقات میں ایسی وحشت شامل ہو گئی جو کئی صدیوں سے قدیم دنیا میں معدوم تھی۔ یورپ میں تاریک صدیوں کے دوران زندگی کے جنسی پہلوکی تذلیل کے لئے مذہب اور بربریت میں ملاپ ہو گیا۔ ازدواجی زندگی میں عورتوں کے حقوق باقی نہ رہے۔ شادی کی حدود سے باہر چونکہ تمام تعلقات گناہ کی ذیل میں شامل تھے، لہذا غیر متمدن مرد کے فطری جذبوں کو دبانے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔ قرون وسطی کی بد اخلاقی عام تھی اور کراہت انگیز بھی۔ بیش اپنی ہی بیٹیوں کے ساتھ گناہ کی زندگی کھلے عام برکرتے تھے جب کہ آرچ بیش صاحبان کے منظور نظر مردوں کو ترقی کے وافر موقع میسر تھے۔ مہبی افراد کے تجربہ کی زندگی گزارنے کا عقیدہ فروغ پذیر تھا، لیکن ان کا عملی چال چلن بالکل مختلف تھا۔ آخر کار تیر ہوئیں صدی کے اوآخر میں ہی پادریوں کو تجربہ کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا جاسکا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعد ازاں بھی عورتوں کے ساتھ ان کے ناجائز تعلقات کا سلسلہ جاری رہا۔ تاہم وہ تعلقات کو کوئی حسن یا وقار عطا نہ کر سکے۔ سبب یہ تھا کہ وہ خود بھی ان رشتہوں ناطوں کو غیر اخلاقی اور ناپاک خیال کرتے تھے۔ چرچ بھی جنس سے متعلق اپنے زاہدانہ نظریے کے سبب محبت کے تصور کو خوبصورت اور دلکش بنانے کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ یہ کام دنیاداروں کو کرنا پڑا۔

یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ اپنے عہد توڑنے اور ایسی زندگی اختیار کرنے کے بعد، جس کو وہ مسلسل گناہ کی زندگی خیال کرتے تھے، مہبی افراد جلد ہی عام دنیاداروں کی سطح سے بھی بہت نیچے گر گئے۔ ہمیں ۲۳ دیں پوپ جان پال کی سیاہ کاری جیسی اکاڈمی مثالوں پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں۔ اس پوپ کو بدکاری اور دوسرا کئی جرام کے علاوہ محramات سے جنسی تعلقات کے الزام میں بھی سزا دی گئی تھی۔ کنسربری میں سینٹ ہو گٹھائے کے منتخب ایبٹ کا قصہ بھی مشہور ہے جس کے بارے میں تفہیش کرنے پر اے

میں معلوم ہوا تھا کہ صرف ایک گاؤں میں اُس کے سترہ ناجائز بچے تھے۔ پسین میں سینٹ پیپلاؤ کے ایک ایبٹ کے بارے میں ۱۱۳۰ء میں ثابت ہوا تھا کہ اُس کی کم از کم ستر داشتائیں ہیں۔ ۱۲۷۳ء میں لشیر کے بشپ ہری سوم کو ۲۵ ناجائز بچوں کا باپ ہونے کے جرم میں معزول کیا گیا تھا۔

خیر، یہ محض چند مثالیں ہیں ان پر زور نہ دیا جائے تو بھی ان کو نسلوں اور کلیساوی مصنفوں کی فراہم کردہ شہادتوں کو نظر انداز کرنا دشوار ہے جنہوں نے ان سے کہیں زیادہ مکروہ براہیوں کی نشاندہی کی ہے۔ یہ دیکھا گیا کہ جب پادری یویاں حاصل کرتے تو یہ علم کہ یہ رشتے ناطے غیر قانونی ہیں، ان کی جنسی وفاداری کے لئے خاص طور پر بتاہ کن ثابت ہوتا۔ ان لوگوں میں ایک سے زیادہ یویاں رکھنے کا رواج بھی عام تھا۔ قرون وسطیٰ کے مصنفوں نے راہبہ عورتوں کی ایسی خانقاہوں کا چچا کیا ہے جن کی کیفیت تجھے خانوں جیسی تھی۔ ان کی چار دیواریوں میں وسیع پیمانے پر اطفال کشی ہوتی۔ پادریوں میں محربات سے جنسی تعلقات کا رواج بھی عام تھا۔ اسی لئے بار بار اس قسم کے احکام جاری کئے جاتے تھے کہ پادری لوگوں کو اپنی ماوں اور بہنوں کے ساتھ رہنے کی اجازت نہ دی جائے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ عیسائیت نے دنیا سے غیر فطری جنسی تعلقات کو ختم کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا، لیکن مسیحی خانقاہوں میں یہ روگ ابھی تک موجود تھا۔

قرون وسطیٰ کے سارے زمانے میں چرچ کی یونانی رومی روایات اور اشرافیہ کی ٹیوٹوں کی روایات کے درمیان بے حد انوکھی قسم برقرار رہی۔ تہذیب و تمدن میں ان دونوں قسم کی روایات نے اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے لیکن یہ کردار ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھا۔ چرچ نے علوم و فنون، فلسفہ، شرعی قانون اور مسیحی دنیا کی وحدت کو فروغ دیا۔ دوسری طرف عام لوگوں نے کامن لاء، سیکولر حکومت کی مختلف صورتوں، جواں مردی، شاعری اور رومانس کے فروغ میں حصہ لیا۔ یہاں ہمیں جس معاملے سے زیادہ دلچسپی ہے، وہ رومانوی محبت ہے۔

یہ کہنا بجانہ ہوگا کہ قرون وسطیٰ سے پہلے رومانوی محبت معروف نہ تھی۔ تاہم یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اسے جذبے کی وسیع پیمانے پر تسلیم شدہ صورت کا درجہ قرون وسطیٰ ہی میں حاصل ہوا۔ رومانوی محبت کا جو ہریوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ اس کے نزدیک محبوب

شئے نہایت ہی گراں قدر ہوتی ہے اور اس کا حصول بہت دشوار ہوتا ہے۔ لہذا محبوب کا دل جیتنے کے لئے اُسے گیت سنگیت، خیافتی، تھیاروں یا محبوب کا دل خوش کرنے والے دوسرے طریقوں کو بروائے کارلا کر بے حد تگ و دوکرنا پڑتی ہے۔ ہزاروں قسم کے پاپڑ بیٹھنے پڑتے ہیں۔ محبوب کی قدر و قیمت کا تصور اس کے حصول میں پیش آنے والی مشکلات کے نفیاں ای اثر سے پیدا ہوتا ہے۔ گویا میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر کسی مرد کو اپنے محبوب کو حاصل کرنے کی راہ میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تو پھر محبوب کے لئے اس کا احساس رومانوی محبت کی صورت اختیار نہیں کرتا۔

قردون و سطی کے دوران جس قسم کی رومانوی محبت منظر عام پر آئی، اُس کا رخ پہلے پہل ایسی عورتوں کی طرف نہ تھا جن سے محبت کرنے والے جائز یا ناجائز جنسی تعلقات قائم کر سکتے۔ اصل میں اس محبت کا رخ اعلیٰ ترین طبقے کی خواتین کی طرف تھا جن کو اخلاق و رواج کی ناقابل عبور رکاوٹیں ان کے چاہنے والوں سے دور رکھتی تھیں۔ چرچ نے مردوں کے دل میں اس خیال کو راست کر دیا تھا کہ وہ جنسی اعتبار سے ناپاک ہیں۔ لہذا وہ کسی ایسی عورت کے بارے میں کوئی شاعر انہ احساس نہ رکھ سکتے تھے جو ان کے لئے قابل حصول ہو۔ گویا محبت بھی وہی خوبصورت ہو سکتی تھی جو افلاطونی قسم کی ہو۔ آج کے انسان کے لئے قردون و سطی کے شاعر عاشقوں کی نفیاں کو اپنے تخلی میں سمجھنا بہت مشکل ہے۔ وہ عاشق محبوب کے وصال کی کسی آرزو کے بغیر ہی محبت کا دم بھرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ آج کے انسان کے لئے یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے اور وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ ان عاشقوں کی محبت محض ایک ادبی رواج کی حیثیت رکھتی تھی۔ بلاشبہ با اوقات معاملہ یہی تھا اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ اُس محبت کے ادبی اظہار پر رواجوں کا پھرہ تھا لیکن بیڑس کے لئے دانتے کی محبت، جیسا کہ وہ Vita Nuova اور Nuova Vita نہ تھی۔ اس کے برخلاف مجھے یوں کہنا چاہیے کہ یہ ایک ایسے شدید جذبے سے عبارت ہے جس سے اکثر جدید لوگ نا آشنا ہیں۔ قردون و سطی کی زیاد عالی طرف رو جیں دنیاوی زندگی کو اچھا نہ سمجھتی تھیں۔ ان کے نزدیک ہماری انسانی جلستیں بے ایمانی اور گناہ آدم کی پیدا وار تھیں۔ وہ لوگ جسم اور اس کے تقاضوں سے نفرت کرتے تھے۔ ان کے خیال میں خالص مسرت تمام جنسی آلاشوں سے پاک و جد آفریں دھیان سے ہی حاصل ہو سکتی تھی۔

اس نظریے نے محبت کے ضمن میں اُس رویے کو جنم دیا جو ہمیں دانتے کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ کسی خاتون سے گہری محبت اور اُس کا احترام کرنے والا کوئی شخص اُس سے جنسی اخلاق کا خیال بھی دل میں لانا محال سمجھے گا، کیونکہ اُس کے نزدیک جنسی تعلق برائی کے زمرے میں داخل ہے۔ یوں اُس کی محبت شاعرانہ اور تخلیقی صورتیں اختیار کرے گی اور فطری طور پر علامتوں سے بھر پور ہو گی۔ جیسا کہ ہم محبت کی شاعری کے بذریعہ ارتقا میں محسوس کر سکتے ہیں، ادب پر اس قسم کی محبت کے اثرات قابل تعریف تھے۔ یہ شاعری شہنشاہ فریدرک دوم کے دربار سے شروع ہوئی اور نشاة ثانیہ کے زمانے میں عروج پر پہنچی تھی۔

قرون وسطیٰ کے آخری ادوار میں محبت کی ایک بہترین تشریع میرے خیال میں ۱۹۲۳ء میں شائع ہونے والی ہری زنگا کی کتاب The waning of Middle Ages میں ملتی ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ ”پروپیش کے مطلب آوارہ گرد شاعروں نے جب بارہویں صدی میں بھوکی خواہش کو محبت کے شاعرانہ تصور میں مرکزی جگہ دی تو تہذیب کی تاریخ میں ایک اہم موڑ پیدا ہو گیا۔ دنیاے قدیم میں بھی محبت کے دکوں کے گیت گائے جاتے تھے۔ لیکن تب انہیں مسرتوں کی آرزو یا اُس کی المانک ناکامی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ جب کہ نیا شاعرانہ آ درش شہو اُنی محبت سے تمام را طبوں کو ختم کئے بغیر ہر قسم کی اخلاقی امنگوں کو خود میں شامل رکھنے کے قابل تھا۔ اس طرح محبت ایک ایسا میدان بن گئی جہاں اخلاقی اور شاقی کمال فروغ پاتے تھے۔ اپنی محبت کے سبب شائستہ عاشق پا کیزہ تھا اور نیک اطوار بھی۔ تیر ہویں صدی کے آخر تک روحانی عصر کا غلبہ بڑھتا چلا گیا۔ دانتے کے زمانے تک یہ تصور عام تھا کہ محبت پاک بازی اور راست بازی کا درس دیتی ہے۔ یہاں معاملہ ایک انتہا تک پہنچ گیا تھا۔ یوں رد عمل کا سلسلہ شروع ہوا اور پہلی اطلاعی شاعری نے کی۔ اس شاعری میں شہو اُنی جذبے کے قدرے حقیقت پسندانہ اظہار کا رواج بذریعہ ہونے لگا۔ محبت پر رومانیت کے جو خوب چڑھائے گئے تھے، وہ ایک ایک کر کے اتنے لگے۔ یہاں تک کہ جلد ہی پاک محبت کا مصنوعی نظام ہمیشہ کے لئے رد کر دیا گیا۔

خیر، فرانس اور برگنڈی میں صورت حال اٹلی سے مختلف تھی۔ وجہ یہ ہے کہ

فرانس کے بالائی طبقے کی محبت کا تعلق اگرچہ سورمائی محبت سے تھا، لیکن وہ نا آسودہ رہنے پر اصرار نہ کرتی تھی۔ اصل میں ہم اُسے چرچ کی تعلیمات کے خلاف رد عمل قرار دیتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُس نے زندگی میں محبت کے جائز مقام سے متعلق پرانے خیالات کو روایج دیا۔ وہ غیر معمولی ناشائستگی کا دور تھا۔ پھر بھی عاشقوں سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ مذہبی مفہوم میں پاک باز نہ ہوتے ہوئے بھی مہذب، شریف نفس اور دلیر ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے خیالات صرف اشرافیہ کے لئے تھے، کیونکہ انہیں نہ صرف فرصت تھی بلکہ کلیساں پابندیوں سے ایک حد تک آزادی بھی حاصل تھی۔ کھلیوں کے مقابلوں میں محبت کے حرکات بالکل واضح تھے اور اس لئے چرچ کو ان سے خاص نفرت تھی۔ لیکن چرچ انہیں ختم کرنے میں بے لس تھا۔ اسی طرح چرچ سورمائی محبت کے نظام کو ختم نہ کر سکتا تھا۔ آج کے جمہوری زمانے میں ہم مختلف ادوار میں اشرافی طبقوں کی طرف سے دنیا پر کئے جانے والے احسانات کو عموماً فراموش کر دیتے ہیں۔ یہ بالکل یقینی ہے کہ اگر محبت کے احیا کے معاملے میں اشرافی سورمائی کی محبتوں نے راہ ہموار نہ کی ہوتی تو نشۃ ثانیہ میں اس قدر کامیابی حاصل نہ ہوتی۔

نشۃ ثانیہ کے زمانے میں پہلیں ازم کے خلاف رد عمل کے نتیجے میں محبت کا افلاطونی انداز پھیکا پڑ گیا، البتہ وہ شاعرانہ ضرورتی۔ پھر بھی قرون وسطیٰ کی روایت کا تھوڑا بہت اشرباقی رہا۔ قرون وسطیٰ کی روایات ہمیں ڈان کی ہوتے اور اس کی ولیمیا میں نظر آتی ہیں۔ اس اثر کو سڈنی کی کتاب اسٹروفل اینڈ سٹیلیا میں واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے اسی طرح شیکپیسر کے بعض سانیٹ بھی اس سے متاثر تھے۔ تاہم مجموعی طور پر نشۃ ثانیہ کی رومنوی شاعری خوش باش اور برآ راست ہے۔ چنانچہ الزبھ عہد کا ایک شاعر کہتا ہے:

Do not mock me in thy bed while these cold nights

freeze me dead.

ہمیں مان لینا چاہیے کہ یہ جذبہ واضح ہے اور برآ راست بھی۔ اسے کسی طور افلاطونی نہیں سمجھا جاسکتا۔ البتہ نشۃ ثانیہ نے شاعری کو کورٹ شپ کے طور پر بروئے کار لانے کا سلیقہ قرون وسطیٰ سے سیکھ لیا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اگرچہ قرون وسطیٰ سے پہلے محبت کی بہت سی شاعری لکھی گئی تھی لیکن اُس کا بہت ہی معمولی حصہ کورٹ شپ کا برآ

راست حصہ تھا۔ ایسی چینی شاعری ہمیں ملتی ہے جو اپنے عاشق سے جدا ہو جانے والی خاتون کے دل کو پیش کرتی ہے۔ اسی طرح صوفیانہ ہندوستانی شاعری بھی ہے جس میں روح کو دلہن کے روپ میں پیش کیا جاتا تھا جو اپنے دلہا کی آمد کی منتظر ہے۔ دلہا خدا کی نمائندگی کرتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کو اپنی محبوب عورتیں اس قدر آسانی سے حاصل ہو جایا کرتی تھیں کہ گیت سنگیت کے ذریعے ان کی توجہ حاصل کرنے اور انہیں خود سپردگی پر مائل کرنے کی ضرورت کم ہی پڑتی تھی۔ فتوں کے نظر سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ محبوباؤں کی سہل دستیابی افسوسناک ہی ہے۔ پسندیدہ بات یہی ہے کہ ان کا ملنا محال نہ ہو، مگر آسان بھی نہ ہو۔ نشأۃ ثانیہ کے بعد سے اس قسم کی صورت حال عام طور پر موجود ہی ہے۔ اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ کچھ تو خارجی ہیں اور کچھ باطنی۔ یہ دوسری قسم کی رکاوٹیں روایتی اخلاقی تعلیم کی بنابری خسیر کی خلش سے جنم لیتی ہیں۔

رومانوی محبت اپنے عروج پر رومانوی تحریک پر پہنچی۔ شیلے کو شاید ہم اس کا بڑا دائی قرار دے سکتے ہیں۔ جب شیلے محبت کا اسیر ہوا تو ایسے نازک احساسات اور وجدانی خیالات میں ان نتائج کو پیدا کرنے والا جذبہ اچھا ہے۔ اسے محبت کو تابو میں رکھنے کا کوئی جواز دکھائی نہ دیتا تھا۔ خیر، جہاں تک اس کے استدلال کا تعلق ہے، وہ فضول سی نفیسات پر مبنی ہے۔ خواہشوں کی راہ میں پیش آنے والی رکاؤں نے اسے شاعری لکھنے پر اسکا یا تھا۔ شیلے میں پائی جانے والی رومانوی محبت ایک غیر مستحکم توازن کی کیفیت پر مبنی تھی۔ اس کیفیت کی نوعیت یہ ہے کہ اس میں روایتی قسم کی رکاوٹیں اگرچہ موجود تھیں لیکن وہ ناقابل عبور نہ تھیں۔ رکاوٹیں اگرنا قابل عبور ہوتیں یا ان کا وجود ہی نہ ہوتا تو پھر رومانوی محبت پر وان نہ چڑھ سکتی تھی۔ ان دونوں میں سے ایک انہا کی مثال ہمیں چینی معاشرے میں ملتی ہے۔ چین کے روایتی معاشرے میں کوئی مرد اپنی بیوی کے سوا زندگی بھر کسی عزت دار خاتون سے نہیں مل سکتا تھا۔ اگر وہ اپنی بیوی سے مطمئن نہ ہوتا تو پھر اسے چکلے کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ چین کے پرانے معاشرے میں شادی بھی اس طرح ہوتی تھی کہ دلہن کا انتخاب دلہا کے عزیز واقارب کرتے تھے اور غالباً اسے شادی کے دن سے پہلے اپنی ہونے والی دلہن کو ایک نظر دیکھنے کا موقع بھی نصیب نہ ہوتا تھا۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کے تمام جنسی رشتے رومانوی مفہوم میں محبت سے عاری تھے اسے اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے

کی اُس جدوجہد سے نہیں گز رنا پڑتا تھا جو محبت کی شاعری کو جنم دیتی ہے۔ اس کے برعکس کامل آزادی کی صورت حال میں محبت کی عظیم شاعری لکھنے کے قابل کسی شخص کو محض اُس کی مردانہ کشش کے ذریعے عورتوں کے معاملے میں اس قدر کامیابی حاصل ہو سکتی ہے کہ اُسے اپنی بہترین تخلیقاتی صلاحیتیں بروئے کار لانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ محبت کی شاعری کا دار و مدار رواج اور آزادی کے درمیان ایک مخصوص نازک توازن پر ہے۔ جہاں کہیں کسی سمت میں بھی یہ توازن درہم برہم ہو جائے وہاں بہترین قسم کی محبت کی شاعری کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔

خیر، محبت کی شاعری محبت کا واحد مقصد ہرگز نہیں ہے۔ رومانوی محبت ایسی صورتوں میں بھی پروان چڑھ سکتی ہے جہاں فن کارانہ اظہار کی ضرورت پیدا نہیں ہوتی۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ رومانوی محبت زندگی کی بہترین مسرتوں کا منبع ہے۔ جذبہ، تخلی اور پیار کی شدت سے ایک دوسرے کو چاہنے والے مردا اور عورت کے رشتے میں کوئی ایسی شیئے ہے جس کی قدر و قیمت ہمارے اندازوں سے باہر ہے اور جس سے محروم رہنا بڑی بد قسمتی کی بات ہے۔ میرے خیال میں ہر سماجی نظام کو اس عظیم مسرت کے حصول کے موافق فراہم کرنے چاہئیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ محبت زندگی کا بڑا مقصد بننے کے بجائے اُس کا محض ایک جزو ہو۔

نئے زمانوں میں، یوں کہہ لیجئے کہ انقلاب فرانس کے بعد سے اس خیال کو تقویت ملتی رہی ہے کہ شادی کو رومانوی محبت کا شر ہونا چاہیے۔ اکثر جدید لوگ اور خاص طور پر انگریزی بولنے والی دنیا کے لوگ اس خیال کو بلا چون و چراقویل کئے ہوئے ہیں۔ انہیں کوئی خبر ہی نہیں کہ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے تک اسے ایک بڑا انقلابی قدم سمجھا جاتا تھا۔ سوڈیڑھ سو سال پہلے کے نالوں اور ڈراموں میں نئی نسل کی اس ”بغاوت“ کا بہت چرچا ہوتا تھا کہ وہ والدین کی طے کردہ روایتی طرز کی شادی کے بجائے شادی کے اس نئے انداز کو اختیار کرنا چاہتے تھے۔ خیر، ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ اس نئے انداز سے اتنے ہی اچھے نتائج سامنے آئے ہیں جتنے اس کی ابتداء کرنے والوں کے پیش نظر تھے۔ مسز میلا پروپ نے اس سلسلے میں ایک اصول وضع کر رکھا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ ازدواجی زندگی میں محبت اور بے زاری دونوں ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی ہیں، اس لئے بہتر ہے کہ آغاز

کسی قدر بے زاری سے کیا جائے۔

سیدھی سی بات یہ ہے کہ جب رومانوی محبت کے زیر اثر اور ایک دوسرے کے بارے میں جنسی علم کے بغیر لوگ شادی رچاتے ہیں تو ان میں سے ہر کوئی دوسرے کو ماورائی خوبیوں کا مالک سمجھتا ہے۔ اس کی توقع ہوتی ہے کہ شادی خوبیوں بھرے طویل خواب کی مانند ہوگی۔ یہ معاملہ خاص طور پر ان عورتوں کے ساتھ پیش آتا ہے جن کی پروشر جہالت اور سخت احتیاط کے ماحول میں ہوتی ہے۔ یوں وہ جنسی بھوک اور رفاقت میں فرق کرنے کے قابل نہیں رہتیں۔ امریکہ میں جہاں شادی کے رومانوی تصور پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور جہاں قانون اور رسم و رواج دونوں کی بنیاد کنواری بوڑھیوں کے سپنوں پر رکھی گئی ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں طلاق کا عام جلن ہو گیا ہے اور خوش باش ازدواجی زندگی خواب و خیال ہو گئی ہے۔

شادی محض دو افراد کی باہمی رفاقت سے لطف اندوز ہونے کا نام نہیں یہ اس سے زیادہ سمجھیدہ معاملہ ہے۔ یہ ایک ادارہ ہے۔ شادی چونکہ بچوں کو جنم دیتی ہے، اس لئے وہ کافی سماجی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی اہمیت میاں اور بیوی کے ذاتی احساسات سے کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ اچھی بات ہو سکتی ہے اور میرے خیال میں تو واقعی اچھی بات ہے کہ رومانوی محبت شادی کا محرك بنے۔ تاہم اس امر کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ جس قسم کی محبت ازدواجی زندگی کو خوش گوار رکھتی ہے اور شادی کے سماجی مقصد کی تکمیل کرتی ہے، وہ رومانوی محبت نہیں بلکہ محبت آفرین اور حقیقت پسندانہ محبت ہے۔

رومانوی محبت میں محبوب کو اس کے حقیقی روپ میں نہیں دیکھا جاتا، کیونکہ جذبوں کی دھنہ اس کے گرد چھائی رہتی ہے۔ بلاشبہ بعض عورتوں ایسی ہیں جو خاص قسم کے شوہر ملنے پر شادی کے بعد بھی اپنے گرد اس ہالے کو برقرار رکھتی ہیں۔ لیکن یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر کے ساتھ حقیقی قربت نہ رکھے اور اپنے حقیقی خیالات اور احساسات کو اس سے چھپائے رکھے اور ایک حد تک اپنے جسم کو بھی شوہر سے دور رکھے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کی چال باز ادا میں شادی کے بہترین امکانات کی تکمیل نہیں ہونے دیتیں۔ ان امکانات کی تکمیل کے لئے کسی ہیر پھیر کے بغیر محبت پر رفاقتیں درکار ہوتی ہیں۔

شاید یہ بھی ہے کہ رومانوی محبت کو شادی کے لئے ناگزیر قرار دینے میں ایک اناکری کا پہلو بھی شامل ہے۔ سینٹ پال کے نقطہ نظر کی طرح، ہم ایک مخالف مفہوم میں کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی محبت میں یہ بات نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ شادی کو اہمیت بچ عطا کرتے ہیں۔ بچوں کا مسئلہ نہ ہوتا تو پھر جنس سے متعلقہ کسی ادارے کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ جو نہیں بچے پیدا ہوتے ہیں، میاں یہوی دونوں یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ایک دوسرے کے بارے میں ان کے احساسات پہلے کی طرح اہم ترین نہیں رہے۔

عورتوں کی آزادی

جنسی اخلاق آج کل جس تبدیلی کے دور سے گزر رہے ہیں اس تبدیلی کے دو بڑے عوامل ہیں۔ ان میں سے ایک مانع حمل دواؤں کی ایجاد ہے اور دوسرا عورتوں کی آزادی۔ یہاں ہم اس دوسرے عامل کو موضوع بحث بنائیں گے۔

عورتوں کی آزادی جمہوری تحریک کا حصہ ہے، اس کا آغاز انقلاب فرانس سے ہوا جس نے وراثت کے قوانین میں لڑکیوں کے حق میں تبدیلیاں پیدا کی تھیں۔ ۱۷۹۲ء میں شائع ہونے والی میری ولسوں کی کتاب Vindication of the Rights of woman اُن خیالات کا شرتحی جنہوں نے ایک طرف تو انقلاب فرانس کو جنم دیا اور دوسری طرف وہ اس انقلاب کے نتیجے میں نمایاں ہوئے۔ اس کے زمانے سے مردوں کے ساتھ عورتوں کی برابری کا دعویٰ نہ صرف مسلسل کیا جا رہا ہے بلکہ اُس کی شدت بڑھتی جا رہی ہے اور کامیابی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ جان سٹورٹ مل کر women بہت مرعوب کرنے والی مدل کتاب ہے جس نے مل کی بعد کی نسل کے غور و فکر کرنے والے افراد پر گہر اثر ڈالا تھا۔

میرے ماں باپ دونوں مل کر پیر و کار تھے۔ میری والدہ ۱۸۲۰ء کے عشرے میں عورتوں کو ووٹ کا حق دلانے کے لیے تقریبیں کیا کرتی تھیں۔ عورتوں کی تحریک سے انہیں اس قدر لگا د تھا کہ میری پیدائش کے وقت بھی انہوں نے پہلی ڈاکٹر خاتون، ڈاکٹر گیرٹ اینڈرسن، کی خدمات حاصل کیں۔ حالانکہ اُس وقت ڈاکٹر صاحبہ کو الیافائیڈ میڈیکل پریکلشنس نہ تھیں، بلکہ صرف سند یافتہ دایہ تھیں۔ اُس ابتدائی ایام میں عورتوں کی تحریک بالائی اور متوسط طبقوں تک محدود تھی، لہذا زیادہ سیاسی قوت کی حامل نہ تھی۔ اُس زمانے میں مسٹر فیٹھ فل بیگ ہر سال برطانوی پارلیمنٹ میں عورتوں کو ووٹ کا حق دینے سے متعلق بل پیش کیا کرتے تھے اور مسٹر شریخ ویز پک اُس کی تائید کیا کرتے تھے۔ تاہم اس بل کے پاس ہونے اور قانون بننے کا کوئی امکان نہ تھا۔

خیر، اس زمانے کے درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والے عورتوں کے حامیوں کو ۱۸۸۲ء شادی شدہ خواتین کے پر اپرٹی ایکٹ کی منظوری کی صورت میں اپنے دائرے میں ایک بڑی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس قانون کے بنے سے پہلے شادی شدہ عورت کی تمام جائیداد اس کے شوہر کے کنٹرول میں ہوتی تھی۔ اس قانون کے بعد کی سیاسی صورت حال کے حوالے سے عورتوں کی تحریک کی تاریخ کوئی پرانی بات نہیں ہے۔ سب لوگ اس سے آگاہ ہیں اور یہاں اُسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اکثر مہذب ملکوں میں عورتوں کو جس تیزی سے سیاسی حقوق حاصل ہوئے، اُس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی، حالانکہ اس تبدیلی کے لیے فقط نظر میں بڑے پیانے پر تغیر و تبدل در کار تھا۔ شاید ہم غلامی کے خاتمے کا حوالہ دے سکتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا ہو گا کہ اول تو جدید زمانے میں یورپی ملکوں میں غلامی کا رواج نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ غلامی کے معاملے میں زن و مرد کے تعلق جیسا کوئی جذباتی عصر شامل نہ تھا۔

عورتوں کی تحریک کی تیزی سے کامیابی کے میرے خیال میں دو قسم کے اسباب ہیں۔ ایک طرف تو جمہوری نظریے کا براہ راست اثر تھا، جس نے عورتوں کے مطالبات کو ناجائز قرار دینا محال بنا دیا۔ دوسری طرف یہ حقیقت تھی کہ ایسی عورتوں کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی تھی جو گھر سے باہر اپنی روزی خود کاتی تھیں اور روزمرہ کی آسائشوں کے لئے اپنے بیپول یا شوہروں کی محتاج نہ تھیں۔ جنگ کے زمانے میں اس صورت حال کو اور بھی فروغ حاصل ہوا، کیونکہ اس زمانے میں مردوں کے بہت سے کام عورتوں کے سپرد کرنے پڑتے تھے۔ عورتوں کو دوٹ کا حق دینے کے مطابق پر جنگ سے پہلے جو اعتراضات کئے جاتے تھے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ عورتیں جنگ کے اہل نہیں ہوتیں اور نہ ہی وہ جنگی کوششوں میں شریک ہو سکتی ہیں۔ ایام جنگ میں عورتوں کی کارکردگی کے بعد یہ اعتراض خود بخود ختم ہو گیا اور جنگ کی تباہ کاریوں میں شریک ہونے کے باعث عورتوں کو دوٹ کا حق دے دیا گیا۔ عورتوں کی تحریک شروع کرنے والے خیال پرست سمجھتے تھے کہ عورتیں سیاست کا اخلاقی معیار بلند کریں گی۔ ظاہر ہے انہیں اس سے مایوسی ہوئی ہو گی لیکن لگتا ہے کہ خیال پرستوں کا مقدرہ ہی یہ ہے کہ جس شے کے لئے وہ جدوجہد کرتے ہیں وہ انہیں ملتی ہے تو ایسی صورت میں کہ ان کے خوابوں کے شیش محل چکنا

چور کر دیتی ہے۔

خیر، عورتوں کے حقوق کی اس اساس ایسے کسی عقیدے پر نہ تھی کہ وہ اخلاقی یا کسی اور حوالے سے مرجوں سے بہتر ہیں۔ یہ اساس بس یہ تھی کہ عورتیں بھی انسان ہیں یا پھر یوں کہیے کہ اس کی اساس جمہوریت کے عمومی اصول پر تھی۔ تاہم اس قسم کے دوسرے معاملات کی طرح یہاں بھی یہ ہوا کہ جب خواتین نے اپنے حقوق کا مطالہ کیا تو ان کے حامیوں نے یہ دعویٰ شروع کر دیا کہ خواتین خاص خوبیوں کی حامل ہوتی ہیں اور یہ کہ ان خوبیوں کا تعلق اخلاقیات سے ہے۔

بہر حال عورتوں کی سیاسی آزادی کا ہمارے موضوع سے تعلق بالواسطہ ہی ہے۔ میری زیادہ دلچسپی ان کی سماجی آزادی سے ہے۔ ماضی میں عورتوں کی پاکدامنی کی حفاظت ان کو الگ تھلگ رکھ کر کی جاتی تھی۔ مشرق کے بعض حصوں میں ابھی تک یہی رواج ہے۔ اس طرح کوشش یہی کی جاتی تھی کہ انہیں گناہ کا کوئی موقع حاصل نہ ہو سکے۔ گناہ اور بدی کے خلاف مدافعت کے لئے انہیں باطنی طور پر مضبوط کرنے کی کوئی کوشش نہ کی جاتی تھی۔ مغرب میں اس طریقہ کار پر کبھی یکسوئی سے عمل نہ کیا گیا تھا۔ تاہم معزز خواتین کو ناجائز جنسی تعلقات سے ڈرانے کی تربیت پہنچنے سے دی جاتی تھی۔ جب تعلیم کے یہ طریق ہائے کارزیادہ سے زیادہ پختہ ہوتے گئے تو یورپی رکاوٹوں کو کم کیا جانے لگا۔ یورپی رکاوٹوں کو کم کرنے کے حامیوں کو یقین تھا کہ اس معاملے میں داخلی رکاوٹیں کافی ہوں گی۔ مثال کے طور پر اتالیقہ (گورننس) کو غیر ضروری سمجھا جانے لگا، کیونکہ اگر کسی اچھی لڑکی کی مناسب تعلیم و تربیت ہوتی ہے تو موقع میسر آنے پر بھی وہ نوجوانوں کے دام میں نہ آئے گی۔

میرے ایام شباب میں معزز خواتین عام طور پر یہ سمجھتی تھیں کہ عورتوں کی بھاری اکثریت کے لئے جنسی اختلاط ناخوش گوار ہوتا ہے اور یہ کہ اسے محض شادی کے بندھوں کے سبب قبول کیا جاتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے نتیجے میں وہ اپنی بیٹیوں کو زیادہ آزادی دینے کا خطرہ مول لینے پر تیار تھیں۔ اس کے نتائج توقع سے کسی قدر مختلف ثابت ہوئے اور یہ فرق شادی شدہ اور کوری دونوں قسم کی عورتوں کے معاملے میں سامنے آیا ہے۔ وکُورین عہد کی عورتیں ذہنی بندی خانے کی زندگی بر کرتی تھیں۔ آج کی اکثر عورتوں کی کیفیت بھی یہی

ہے یہ جیل چونکہ تحت الشعور میں دبی ہوئی خواہشوں سے وجود میں آتی ہے اس لئے شعور کو اس کا علم نہ تھا۔ ہمارے عہد کی نوجوان لڑکیوں نے اس جیل اور دبی ہوئی خواہشوں کے خلاف بغاوت کی ہے۔ یوں شعور کی سطح پر وہ جملی خواہشیں پھر سے نمایاں ہو گئی ہیں جو مصنوعی شرم و حیا کے پھاڑوں تک دبی ہوئی تھیں۔ اس سے نہ صرف کسی ایک ملک یا طبقہ بلکہ تمام مہذب ملکوں اور طبقوں کی جنسی اخلاقیات پر گھرے انقلابی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

ابتداء ہی سے عورتوں اور مردوں کے درمیان برابری کے مطالبے نے نہ صرف سیاسی معاملات بلکہ جنسی اخلاقیات سے بھی تعلق رکھا ہوا تھا۔ میری ولسوں کرافٹ کارو یہ مکمل طور پر چدید تھا۔ تاہم بعد کی نسل میں خواتین کے حقوق کے لئے کام کرنے والے اس معاملے میں اُس کے نقش قدم پر نہیں چلے۔ میری ولسوں کرافٹ کے بر عکس وہ سخت قسم کے اخلاق پرست تھے۔ وہ چاہتے یہ تھے کہ مردوں کے پاؤں میں بھی وہ بیڑیاں ڈال دی جائیں جو اب تک صرف عورتوں کے پاؤں میں رہی تھیں۔ بہر حال ۱۹۱۲ء کے بعد سے زیادہ منطق بگھارے بغیر نوجوان عورتیں مختلف رو یہ اختیار کرتی رہی ہیں۔ بلاشبہ اس نے رو یہ کا بڑا سبب پہلی جنگ عظیم کا جوشیلا لولہ تھا۔ تاہم جنگ نہ ہوتی تو بھی وہ زیادہ تاخیر کے بغیر پیدا ہونا ہی تھا۔ ماضی میں عورتوں کی پاکبازی کے دو بڑے عوامل دوزخ کی آگ کا خوف اور حمل ٹھہر نے کا ڈر تھا۔ مذہب کے زوال سے پہلا حرف ختم ہو گیا جب کہ دوسرے ڈر کو مانع حمل دواؤں نے دور کر دیا۔ رسم و رواج کی قوت اور ڈھنی جو دکی بدولت روایتی اخلاقیات مانع حمل دواؤں نے دور کر دیا۔ رسم و رواج کی قوت اور ڈھنی جو دکی بدولت روایتی اخلاقیات تھوڑے بہت وقت تک برقرار رہنے میں کامیاب ہو گئی۔ تاہم جنگ کے دھماکے نے اُس کی بوسیدہ دیواریں مسماڑ کر دیں۔ آج کی عورتوں کے حقوق کے علمبردار نصف صدی پہلے کے علمبرداروں کی طرح مردوں کے ”گناہوں“ کو کم کرنے کے بارے میں پُر جوش نہیں ہیں۔ اس کے بجائے وہ یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ مردوں کے لئے جائز ہے اُسے عورتوں کے لئے بھی رواہونا چاہیے۔ ان کے پیش رواخلاقی غلائی میں برابری تلاش کرتے تھے۔ جب کہ یہ خود اخلاقی آزادی میں برابری کے مثلاشی ہیں۔

فی الحال یہ ساری تحریک ایک ابتدائی مرحلے میں ہے اور یہ کہنا ممکن نہیں کہ بالآخر وہ کیا صورت اختیار کرے گی۔ اس کے حامی اور پیروکار زیادہ تر نوجوان ہیں۔ با اثر اور

اہم افراد میں سے بہت کم ان کے حامی ہیں۔ اقتدار کے ان مالکوں کے علم میں جب کبھی متعلقہ حقوق آتے ہیں تو پولیس، قانون، مذہبی علماء اور خود ان نوجوانوں کے والدین ان کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ تاہم عام طور پر یہ نوجوان اس قدر نیک دل ہیں کہ وہ ان لوگوں سے حقوق پوشیدہ رکھتے ہیں جن کو ان حقوق کا علم ہونے پر دکھ پہنچ سکتا ہے۔ جسٹس لینڈز سے جسے ان حقوق کا چرچا کرنے والے مصنفوں کو بزرگ نوجوانوں کی توہین کرنے والا خیال کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ نوجوان اس توہین سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔

بہر حال اس قسم کی صورت حال غیر مستحکم ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ دوامکانات میں سے پہلے کس کی تیکیل ہو گی۔ یعنی آیا بزرگوں کو حقوق کا پتہ چل جائے گا اور وہ نوجوانوں کو ان کی نئی ملنے والی آزادی سے محروم کرنے پر تل جائیں گے، یا یہ ہو گا کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ نوجوان معاشرے میں اہم اور محترم مقامات حاصل کر لیں گے اور اس نئی اخلاقیات کو اخترائی کی تائید لادیں گے۔ یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ بعض ملکوں میں پہلی قسم کی اور دوسرے ملکوں میں دوسری قسم کی صورت حال سامنے آئے گی۔ مثال کے طور پر اٹلی میں دوسرے تمام امور کی طرح بد اخلاقی کے خاتمے کو بھی حکومت نے اپنی ذمہ داریوں میں شامل کر رکھا ہے۔ لہذا وہاں پاکبازی کی بھائی کے لئے شدید کوشش جاری ہے۔ روس میں صورت حال اس کے بالکل بر عکس ہے۔ وہاں کی حکومت نئی اخلاقیات کی خود حامی ہے۔ جرمی کے پروٹوٹپ علاقوں میں آزادی کی فتح کی توقع کی جاسکتی ہے، جب کہ کیتوںک علاقوں میں معاملہ مشکوک ہے۔ فرانس اپنے قدیم رواج سے باہر شاید ہی قدم رکھے گا جس میں بد اخلاقی کی بعض صورتوں کو برداشت کیا جاتا ہے، لیکن ان سے آگے جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ البتہ میں اس بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا کہ برطانیہ اور امریکہ میں کیا ہو گا۔

آئیے، اب ہم ایک لمحہ توقف کر کے عورتوں اور مردوں کے درمیان برابری کے مطالبے سے پیدا ہونے والے منطقی نتائج پر ایک نظر ڈالیں۔ نظری طور پر نہ سہی، لیکن عملی طور پر صورت حال یہ ہے کہ زمانہ قدیم ہی سے مردوں کو ناجائز جنسی تعلقات کی آزادی حاصل ہے۔ مرد سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ شادی کے موقع پر کنوارا ہو گا۔ بلکہ شادی کے بعد بھی اگر بیوی اور بہسایوں کو خبر نہ ہو تو ناجائز جنسی تعلقات کو خطرناک نہیں سمجھا جاتا۔ اس

نظام کو عصمت فروشی نے برقرار رکھا ہے۔ جدید انسان کے لئے عصمت فروشی کے ادارے کا دفاع کرنا مشکل ہے، یہ بہت کم لوگ ہی یہ رائے دیں گے کہ مرد عصمت فروشوں کا ایک طبقہ بھی تیار کیا جائے تاکہ جو عورتیں اپنے شوہروں کی طرح، پاکبازی کا فریب کارانہ لبادہ اوڑھ رکھنا چاہتی ہیں، ان کی تسلیکیں کامان مہیا کیا جاسکے۔

اس کے باوجود یہ بات یقینی ہے کہ چونکہ آج کل شادیاں عموماً تاخیر سے ہوتی ہیں اس لئے ایسے مرد کم ہی ہوں گے جو اپنے طبقے کی کسی عورت کے ساتھ گھربانے تک پارسار ہیں۔ اب اگر غیر شادی شدہ مرد پارسائیں رہ سکتے تو پھر مساوی حقوق کی بنیاد پر عورتیں بھی دعویٰ کریں گی کہ انہیں شادی سے پہلے سات پردوں کے پیچھے بھپ کر رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اخلاق پرستوں کے لئے یہ صورت حال بلاشبہ افسوسناک ہوگی۔ روایتی اخلاق پرست اگر سوچنے کی زحمت گوارا کریں تو اس نتیجے تک پہنچ بغير نہ رہیں گے کہ ہمارے اخلاقی معیار دھرے ہیں، یعنی یہ سمجھا جاتا ہے کہ جنسی پاکیزگی مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے لئے زیادہ ضروری ہے۔ یہاں یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ روایتی اخلاقیات مردوں سے بھی پاکبازی کا مطالبہ کرتی ہے۔ تاہم اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ مردوں کو یہ مطالبہ قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کے لئے چھپ کر گناہ کرنا آسان ہے۔

اس طرح روایتی اخلاق پرست اپنی مرضی کے خلاف یہ مانے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان برابری نہیں ہے، بلکہ وہ یہ بھی اقتدار کرتا ہے کہ نوجوانوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے طبقے کی کسی لڑکی کے بجائے طوائفوں کے ساتھ جنسی تعلق قائم کریں، حالانکہ اگر وہ اپنے طبقے کی لڑکیوں کے ساتھ جنسی ربط رکھیں تو یہ ربط نہ صرف روپے پیسے کی لائچ سے محفوظ ہوگا بلکہ زیادہ خوش گوارا اور مسٹ انگیز بھی ہو سکتا ہے۔ تاہم اخلاقی معلم اُس اخلاقی نظام کی وکالت کرنے کے مضمرات پر غور نہیں کرتے جس کے بارے میں انہیں معلوم ہو کہ اُس پر عمل نہ کیا جائے گا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک وہ عصمت فروشی کی وکالت نہ کریں۔ تب تک وہ اس حقیقت کے ذمہ دار نہیں کہ عصمت فروشی ان کی تعلیمات کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ خیر، یہ بات اس جانے پیچانے امر واقعہ کی ایک اور مثال ہے کہ ہمارے زمانے کے پیشہ ور معلمین اخلاق اوس طور پر جیسے کی ذہانت سے بھی محروم ہیں۔

مندرجہ بالا حالات کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ معاشری اسباب کی بنا پر مرد جلد

گھر بانے کے قابل نہیں ہوتے۔ دوسری طرف بہت سی عورتیں شادی سے محروم ہی رہ جاتی ہیں۔ اس لئے عورتوں اور مردوں کے درمیان مساوات کا تقاضا یہ ہے کہ نسوانی پاکبازی کے روایتی معیاروں میں لچک پیدا کی جائے۔ مردوں کو اگر شادی سے پہلے کھل کر کھلیے کے موقع میسر ہیں تو پھر عورتوں کو بھی اس قسم کی آزادی ملنی چاہیے۔ کئی معاشرے ایسے ہیں جن میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے اس طرح محض تعداد کے سبب کئی عورتیں شادی سے محروم رہ جاتی ہیں۔ ایسی عورتوں کو جنسی مسrt سے محروم رکھنا پر لے درجے کی نا انصافی ہے۔ یہ بجا ہے کہ عورتوں کی تحریک کے بانیوں نے اس قسم کے مضمرات پر غور نہ کیا تھا، تاہم ان کے جدید پیر و کاران کا واضح ادراک رکھتے ہیں اور جو کوئی ان تماج کی مخالفت کرتا ہے وہ جنسی معااملے میں عورتوں کے ساتھ انصاف کے حق میں نہیں ہیں۔

اس ساری بحث سے ایک مسئلہ بہت ہی واضح صورت میں سامنے آتا ہے۔ اگر دو شیراؤں سے پاک بازی اور بیویوں سے وفاداری کا تقاضا ب نہیں ہونا چاہیے تو پھر ضروری ہے کہ یا تو ہم خاندان کے تحفظ کے لئے نئے طریقے واضح کریں یا پھر اس کے خاتمے کو قبول کر لیں۔ یہ تجویز کیا جاسکتا ہے کہ بچوں کی پیدائش کی اجازت صرف شادی کے بندھن کے اندر دی جائے اور شادی کے دائرے سے باہر جنسی اختلاط پر مانع حمل دواؤں کا استعمال لازم قرار دیا جائے۔ اس صورت میں شوہر اپنی بیویوں کے عاشقوں کو قبول کرنا ویسے ہی سیکھ سکتے ہیں جس طرح اہل مشرق نے بیویوں کو قبول کر رکھا ہے۔ تاہم اس سارے خاکے میں ایک دشواری موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہاں ہم بیویوں کے پچھے ہونے اور مانع حمل دواؤں کے موثر ہونے پر مقتول حد سے زیادہ اعتماد کر رہے ہیں۔ ممکن ہے وقت کے ساتھ ساتھ یہ مشکل کم ہوتی چلی جائے۔ تئی اخلاقیات سے مطابقت رکھنے والی ایک اور متبادل صورت یہ ہو سکتی ہے کہ معاشرے میں باپ کو جواہیت حاصل ہے وہ ختم کر دی جائے اور باپ کے فرائض ریاست کے سپرد کر دیے جائیں۔ ہاں کسی خاص صورت میں اگر کسی شخص کو یقین ہو کہ وہ فلاں بچے کا باپ ہے اور اسے بچے سے لگاؤ بھی ہو تو اسے رضا کارانہ طور پر ماں بچے کی مالی مدد کرنے کی اجازت دے دی جائے تاہم یہ کام وہ اپنے طور پر کرے اور قانون کے ذریعے اس کو اس کام پر مجبور نہ کیا جائے۔ اس طرح تمام بچوں کی حالت وہی ہو گی جو آج کل ان ناجائز بچوں کی ہوتی ہے جن کے باپ کا کوئی

علم نہیں ہوتا۔ البتہ ریاست اس صورت حال کو معمول کے مطابق خیال کرے گی اور بچوں کی پرورش پر آج کے مقابلے میں زیادہ توجہ دے گی۔

اس کے برعکس اگر پرانے اخلاقی نظام کا احیا مقصود ہے تو اس کے لئے بعض چیزوں کی ضرورت ہو گی۔ ان میں سے چند ایک پہلے بھی عمل ہوتا ہے لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ محض وہ کافی نہیں ہے۔

روایتی اخلاق کے احیا کے لئے پہلی لازمی بات یہ ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم ایسی ہو جو انہیں احقر، تو ہم پرست اور جاہل بناسکے۔ یہ تقاضا ان سکولوں میں پہلے ہی پورا ہو رہا ہے جو مذہبی افراد اور اداروں کے کنٹرول میں ہیں۔ دوسری لازمی بات یہ ہے کہ جنسی موضوعات پر معلومات فراہم کرنے والی تمام کتابوں پر کڑی سنسرب شعب عائد کی جائے۔ ہمارے ہاں یہ شرط بھی خاصے موثر انداز میں پوری ہو رہی ہے۔ اچھا ہمارے ہاں یہ دونوں شرائط پوری ہو رہی ہیں، لیکن روایتی اخلاق کا احیاء نہیں ہو رہا، تو صاف طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کافی نہیں ہیں۔ اس کے لئے مزید اس بات کی ضرورت ہے کہ نوجوان عورتوں کو مردوں کے ساتھ میل جوں کے تمام موقع سے محروم کر دیا جائے۔ لڑکیوں کو گھر سے باہر محنت مزدوروی اور کام کا ج کے لئے نہ جانے دیا جائے۔ ماں یا خالہ کی رفاقت کے بغیر انہیں گھر سے قدم باہر نہ رکھنے دیا جائے۔ آیا کے بغیر تقاریب میں شرکت کی افسوسناک رسم ختم کر دی جائے۔ پچاس برس سے کم عمر کی کسی غیر شادی شدہ عورت کو موثر کار رکھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ زیادہ دانش مندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ تمام غیر شادی شدہ عورتوں کا ہر مہینے طبی معافی کرو دیا جائے اور ان میں سے جو کنواری ثابت نہ ہوں انہیں اصلاحی قید خانے میں بند کر دیا جائے۔ مانع حمل دواؤں کا استعمال منوع قرار دیا جائے اور کنواری عورتوں کے ساتھ گفتگو میں جہنم کی آگ کو رکھا جائے اور اس کے بارے میں کسی بھی شبے کو غیر قانونی قرار دیا جائے۔

ان تمام اقدامات پر سو سال یا اس سے بھی زیادہ عرصے تک تختی سے عمل کیا جائے تو پھر شاید بد اخلاقی کے بڑھتے ہوئے طوفان کو کسی حد تک روکا جاسکے گا۔ تاہم میرے خیال میں بعض خرابیوں سے بچنے کے لئے یہ بھی مناسب ہو گا کہ تمام پولیس میں اور ڈاکٹروں کو مردانہ صفات سے محروم کر دیا جائے۔ غالباً اس پالیسی میں دانش مندی کا تقاضا

یہ ہے کہ ایک قدم اور آگے کی طرف اٹھایا جائے اور معلمین اخلاق کو یہ مشورہ دیا جائے کہ وہ تمام مردوں کو مردانہ صفات سے محروم کرنے کی حمایت کریں۔ اس سلسلے میں صرف مذہبی افراد سے ساتھ رعایت کی جاسکتی ہے، لیکن اخبارات میں ان کے جنسی کارنامے پڑھ کر خیال آتا ہے کہ یہ رعایت بھی حمایت ثابت ہوگی۔

یہ امر بالکل واضح ہے کہ ہم جو راہ بھی اختیار کریں اُس میں مشکلات اور اعتراضات ضرور سامنے آئیں گے۔ اگر ہم نئی اخلاقیات کو پھلنے پھولنے دیں تو لازمی طور پر وہ آگے کی طرف بڑھے گی اور ایسی مشکلات پیدا کرے گی جن کا ابھی کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکا ہے۔ دوسری طرف اگر ہم دنیاے جدید میں ایسی پابندیاں نافذ کریں جو گئے گزرے زمانوں میں ممکن تھیں تو پھر ہمیں ایسے قواعد و ضوابط کی ختنی سے پابندی کروانی ہوگی جو حال یہیں اور جن کے خلاف انسانی فطرت جلد ہی سرکشی پر اترائے گی۔

یہ امر اس قدر واضح ہے کہ ہمیں تمام خطرات اور مشکلات کے باوجود دنیا کو آگے بڑھنے دینا چاہیے اور اسے پیچھے کی طرف نہیں کھینچنا چاہیے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں ایک حقیقی نئے اخلاق کی ضرورت ہوگی۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ زندگی میں فرائض اور ذمہ داریاں تو موجود ہی رہیں گی، البتا ان کی نوعیت اور صورت ماضی میں طے پانے والی فرائض اور ذمے داریوں سے مختلف ہو سکتی ہے۔ ہمارے معلمین اخلاق جب تک ماضی کے گئے گزرے اخلاقی نظام کی طرف واپسی کے گئن گانے مگن رہیں گے، تب تک وہ نئی آزادی کو اخلاقی انداز دینے یا اُس آزادی سے پیدا ہونے والے نئے فرائض کی نشادی کے لئے کچھ نہ کر سکیں گے۔ میرا نہیں خیال کہ نئے نظام کو انسانی خواہشوں اور ترکوں کے آگے سر جھکا دینا چاہیے۔ تاہم میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ خواہشوں اور جذبوں کے آگے بند باندھنے کے موقع اور اسباب اب وہ نہ ہوں گے جو ماضی میں ہوا کرتے تھے۔

چیزیں یہ ہے کہ جنسی اخلاق کے پورے مسئلے پر ازسرنوغور و فکر کی ضرورت ہے۔



MashalBooks.Org

MashalBooks.Org